مسلمان کی طرزِ زندگی

قرآن حکیم کی نظر میں

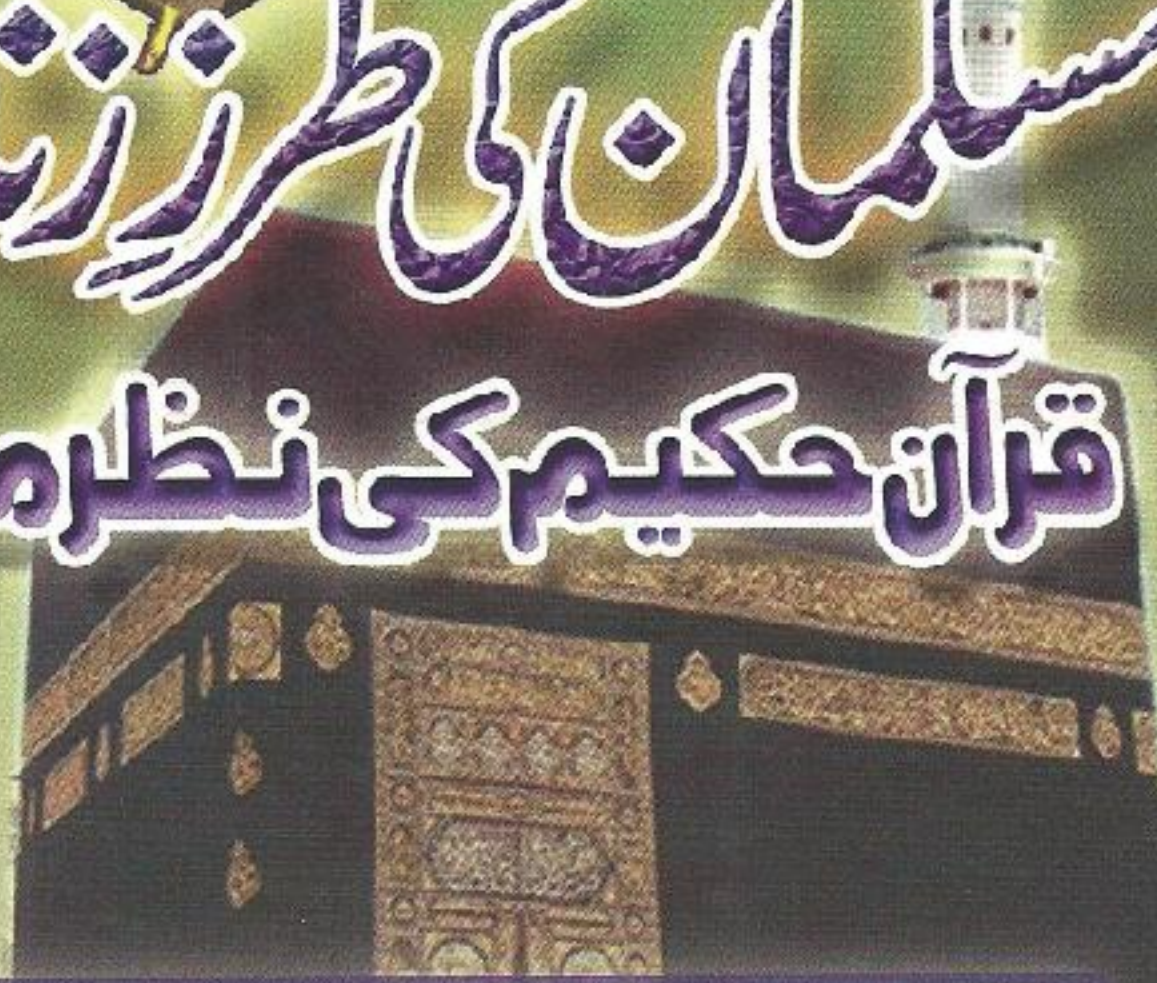

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید، فرقان حمید کے ذریعہ خیر وشر، نیک وبد اور اچھائی وبرائی کے جو معیارات ہم کو بتادیئے ہیں، وہ حرفِ آخر ہیں۔ اور تمام دُنیا کے لئے لائق تسلیم ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ تسلیم کئے جائیں گے۔ دین اسلام کی تعلیمات ابدی اور دائمی ہیں۔ اسلام نے جن چیزوں کو برا کہہ دیا، بس وہ بری ہیں اور دین اسلام نے جن اعمال وافعال کو اچھا کہہ دیا ہے، بس وہ اچھے ہیں۔ ایک مسلمان کو اپنی زندگی قرآن وسنت کی روشنی اور ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنے کا فریضہ ادا کرنا چاہیے۔

از قلم قاری محمد اکرام غفرلہٗ

مدرس! مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال ضلع چکوال

مسلمان کی طرزِ زندگی

قرآن حکیم کی نظر میں

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید، فرقان حمید کے ذریعہ خیر و شر، نیک و بد اور اچھائی و برائی کے جو معیارات ہم کو بتا دیئے ہیں، وہ حرفِ آخر ہیں۔ اور تمام دنیا کے لئے اٹل تسلیم ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ تسلیم کئے جائیں گے۔ دین اسلام کی تعلیمات ابدی اور دائمی ہیں۔ اسلام نے جن چیزوں کو برا کہہ دیا بس وہ برائی ہیں اور دین اسلام نے جن اعمال کو اچھا کہہ دیا ہے بس وہ اچھے ہیں۔ ایک مسلمان کو اپنی زندگی قرآن و سنت کی روشنی اور ہدایات الٰہی کے مطابق ڈھالنے کا فریضہ ادا کرنا چاہیے۔

از قلم قاری محمد اکرام غفرلہٗ

مدرس: مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال ضلع چکوال

النور مینجمنٹ ڈب مارکیٹ چکوال 0334-8706701

آئینہ کتاب

دینی تحفہ	4
تقریظ: مولانا عبدالقیوم حقانی دامت برکاتہم	5
مقدمۃ الکتاب: حضرت استاذی المکرّم	6
حرفِ آغاز	9
اساسِ اسلام	11
توحید	12
اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ایک ماننا	13
وحی کے اتباع کی ضرورت	14
تصورِ آخرت کا اثر اعمال پر	15
انسان کی زندگی کا مقصد	16
ایمان کی روشنی	17
ایمان اور یقینِ محکم	18
اسلام کے تقاضے	19
(الف) قرآن کریم کی تعظیم وتکریم	20
(ب) قرآن کریم کی تعظیم وتکریم	21
تلاوت قرآن کریم کے فضائل	22
قرآن کی بے ادبی کی صورتیں	23
حکومتِ قرآن	24
اسلام میں حیاتِ دنیوی کا تصور	25
رسالت	26
(الف) فرائضِ رسالت	27
(ب) فرائضِ رسالت	28
نبی رحمت ﷺ قرآن کی نظر میں	29
اطاعتِ رسول ﷺ	30
نبی رحمت ﷺ بحیثیت سربراہِ ملت	31
نبی رحمت ﷺ کے اخلاق اعلیٰ	32
ختم نبوت	33
نبی کریم ﷺ کے حقوق	34
نبی کریم ﷺ کی خاص خصوصیت	35
محبت رسول ﷺ کا پہلا حق	36
عقیدہ حیاۃ النبی ﷺ	37
قرب الٰہی کا مختصر راستہ درود شریف	38
توہین رسالت ناقابل معافی جرم ہے	39
اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے حقوق	40
بندگی نعمت خداوندی	41
محبت الٰہی کا معیار	42
محبت الٰہی کے تقاضے	43
اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے عہد	44
ذکر اللہ کی کثرت	45
(الف) خشیتِ الٰہی	46
(ب) خشیت الٰہی	47
رحمت الٰہی	48
(الف) اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے مقبول بندے	49
(ب) اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے مقبول بندے	50
صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان وعظمت	51
گستاخ صحابہ رضی اللہ عنہم خارج اسلام ہے	52
خودی اور عبدیت	53
اللہ تعالیٰ سے سرکشی کا انجام	54
اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو بھلا دینا	55
علم حاصل کرنے کی فضیلت	56
تعلیم کا مقصد	57
دین میں تحصیل علم کی اہمیت	58
اسلام کی نظر میں اہلِ علم کا مقام ومرتبہ	59

UMAR SHAHEED LIBRARY Mouza Kotli Chakwal (Punjab) Pakistan

آئینہ کتاب

تزکیہ نفس	60
تربیت نفس	61
حقوق نفس	62
استقامت اور ثابت قدمی	63
عدل وانصاف	64
شکرِ رب جلیل	65
اخلاص نیت اور اخلاص عمل	66
اپنی زندگی کا محاسبہ	67
برائیوں سے اجتناب	68
علمائے حق کی بے ادبی سخت گناہ ہے	69
دعوت کے آداب	70
مسلسل عمل	71
آدابِ مساجد	72
اللہ کی نعمتیں اور ان کے مقاصد	73
دوسروں کو تکلیف سے بچائیے	74
توبہ میں دیر مت کرو	75
نماز کو پورے اہتمام سے ادا کرو	76
تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کرنے کی فضیلت	77
سارے دین کا خلاصہ	78
اتحادِ امت	79
ایک مسلمان کو کیسے رہنا چاہیئے	80
مسلمانوں کے زوال کا سبب	81
خیر میں تعاون رضائے الٰہی کا وسیلہ	82
اجتماعی فلاح	83
امن وسلامتی	84
آپس میں جھگڑا نہ کرو	85
آخرت کی تیاری	86
صبر کے مواقع	87
دنیا اور آخرت	88
انفاق فی سبیل اللہ	89
نکاح میں تاخیر کیوں؟	90
عہد وپیمان	91
آدابِ معاشرت	92
رسم ورواج کی پابندی	93
محفل کے آداب	94
مجلس کے آداب	95
دعا کی فضیلت واہمیت	96
دعا آہستہ یا اونچی	97
معاف کرنے کا اجر وثواب	98
مردوں کی ایک کوتاہی	99
حسن عمل نہ کہ کثرت عمل	100
مصائب کا علاج	101
سب سے پہلے جنت میں جانے والے	102
اصلاح معاشرہ	103
حقوق العباد	104
فریضۂ جہاد اور ہم	105
ایمان، قتال اور تبلیغ	106
مسلمان کا لباس	107
حلال چیزیں کھاؤ	108
حلال کمانا فرض ہے	109
سفر کے آداب	110
خوش کلامی	111
ماخذ	112

UMAR SHAHEED LIBRARY MOHRA CHOHAN (CHAKWAL) PAKISTAN
شہید لائبریری موہڑہ کوہاتم (چکوال) پاکستان

دینی تحفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

☆ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ تحفے میں بہترین چیز پیش کرے۔

☆کیا آپ جانتے ہیں کہ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی طرف سے سب سے بہترین چیز کیا ہے؟

☆یاد رکھئے! ایک مسلمان کے لئے سب سے بہترین تحفہ دینی علوم سے واقفیت ہے، اپنے دوستوں اور عزیزوں کو یہ کتاب تحفہ میں پیش کر کے ہم تھادوا تحابو والی حدیث پر عمل کر سکتے ہیں جس کا معنیٰ ہے کہ: ''تم ایک دوسرے کو ہدیہ لیا دیا کرو آپس میں محبت بڑھے گی۔''

☆اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر آپ محسوس کریں کہ یہ آپ کے گھر والوں.....رشتہ داروں.....دوستوں.....اور معاشرے کے دیگر افراد بشمول اسکول، کالج اور مدارس کے طلبہ کے لئے مفید ہے تو آپ کا انہیں یہ کتاب تحفے میں پیش کرنا آخرت میں سرمایہ کاری اور سماجی ذمہ داری کا حصہ ہوگا۔

☆.....نیکی پھیلانے، علم دین اور دینی کتابوں کی اشاعت کا ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔

☆.....لہٰذا اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں، محلے کی مسجد، لائبریری، کلینک، محلے کے اسکول اور مدارس کی لائبریری تک پہنچا کر معاشرے کی اصلاح میں معاون و مددگار بنئے۔

☆.....کتاب کو تحفہ میں دے کر آپ علمی دوست بن سکتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بنا سکتے ہیں، اس لئے کہ کتاب جہاں کہیں بھی رکھی جاتی ہے وہ لوگوں کو پڑھنے کی طرف دعوت دیتی ہے اور جب لوگ دینی، معاشرتی اور اخلاقی احکام و ہدایات سے باخبر ہوں تو ان شاءاللہ باعمل بھی ہوں گے۔

☆.....اگر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے گنجائش و استطاعت عطا کی ہو تو کم از کم دس کتابوں کو لے کر والدین اور اساتذہ کرام کے ایصالِ ثواب کے لئے وقف کریں، یا رشتہ داروں، دوستوں کو خوشی کے مواقع پر پیش کر کے دین اور دنیا کے فوائد اپنائیے۔

کتاب دینا ہمارا کام ہے، مطالعہ کی توفیق اور پھر ہدایت دینا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا کام ہے، ہم اپنا کام کرنے کی کوشش کریں گے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہماری مدد فرما کر مطلوبہ نتائج بھی ظاہر فرمائیں گے۔

تقریظ

مولانا حافظ عبدالقیوم حقانی صاحب دامت برکاتہم

مہتمم جامعہ ابوہریرہ خالق آباد نوشہرہ

الحمد لحضرۃ الجلالۃ والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم الرسالۃ امابعد!

اسلام ایک مکمل دستورِ حیات ہے، زندگی کے ہر شعبے اور ہر موڑ کی رہنمائی کرنے والا مذہب اگر ہے، تو وہ اسلام ہی ہے، اسلامی تعلیمات اور نبوی طریقوں پر ہر دور میں اکابر علماء اور مشائخ لکھتے رہے ہیں اور تا قیامِ قیامت لکھتے رہیں گے، اس لئے کہ قرآن اور اسلام ہی سرچشمۂ ہدایت ہیں۔

قاری محمد اکرام صاحب ایک باصلاحیت نوجوان اور بہترین انشاء پرداز ہیں اور قابل مصنف ہیں "مسلمان کی طرزِ زندگی قرآن کی نظر میں" آپ کی تازہ ترین تالیف ہے، قاری صاحب نے اہم عنوانات قائم کرکے اس کے مطابق قرآنی آیات، ترجمہ وتفسیر نہایت اچھے انداز میں مرتب کیا ہے۔ چند عنوانات پڑھ کر اندازہ ہوا کہ کتاب ہر مسلمان کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ مؤلف کی سعی قبول فرماوے اور مزید علمی اور تحقیقی کاموں کی توفیق رفیق ہوں۔ وَصلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن.

عبدالقیوم حقانی

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ

UMAR SHAHEED LIBRARY Mohra Kot Mohra Noorpur Tehsil Pind Dadan Khan (Jhelum) Website: www.umarshaheedlibrary.com
عمر شہید لائبریری موہرہ کوٹ موہرہ نورپور تحصیل پنڈ دادن خان (جہلم)

مقدمۃ الکتاب

استاذی المکرم حضرت مولانا محمد شفیق صاحب دامت برکاتہم العالیہ

استاذ الحدیث جامعہ عربیہ اظہار الاسلام وخطیب مکی جامع مسجد چکوال

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ!

اللہ رب العزت نے اپنی تمام مخلوقات میں انسان کو اشرف بنایا ہے، پھر اس کی ہدایت واصلاح کے لئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا۔ آخری نبی ہمارے آقا ومولیٰ سرکارِ دوعالم، رحمت کائنات، فخرِ موجودات ﷺ کو عظیم انسان بنا کر بھیجا اور قیامت تک کے لئے آپ ﷺ کی ذات کو مبعوث فرما کر قرآن وحدیث کی شکل میں آپ ﷺ کی تعلیمات کو باقی رکھا، سرورِ دوجہاں، رحمتِ کائنات ﷺ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دینی تعلیمات کو لے کر آگے امت تک پہنچایا یعنی جن چیزوں سے انسان اکمل واشرف بنتا ہے وہ سب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں اور آقا دوجہاں نبی رحمت ﷺ نے احادیث مبارکہ میں بیان فرمادیا اور عمل کر کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بتادیا گویا کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عملی نمونہ تھے۔ اب ہم نے زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اگر ہدایت حاصل کرنی ہے تو قرآن مجید اور احادیث پاک اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عملی نمونہ کے مطابق کرنی ہے، اب اگر نعوذ باللہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو درمیان سے نکال دیا جائے تو عملی نمونہ کہاں سے ملے گا، اس لئے ہمیں لازماً صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ماننا پڑے گا اور ان کی زندگی کے مطابق ہمیں اپنی زندگی بنانا پڑے گی، تب ہم ہدایت پر اور سیدھے راستہ پر ہیں۔ کیونکہ خود قرآن حکیم اور فرقان حمید نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو معیار قرار دیا ہے، حق تعالیٰ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِہٖ فَقَدِ اھْتَدَوْا ج ''اس کے بعد اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو یہ راہِ راست پر آجائیں گے۔'' (البقرۃ، آیت نمبر ۱۳۷)

یعنی قیامت تک آنے والوں کا ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرح ہے تو پھر وہ ہدایت پر ہیں وگرنہ نہیں جب ایمان جیسی اعلیٰ وارفع چیز میں ان کی نقل ضروری ہے، تو پھر عمل بطریق اولیٰ ضروری ہے کیونکہ رحمت دوجہاں حضور نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث پاک میں ارشاد فرمایا: ما انا علیہ واصحابی یعنی نشان نجات حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ ہے، یہی کامیابی اور نجات کا مدار ہے اس لئے ہدایت پر آنے کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ماننا ضروری ہے۔

پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد تابعین، تبع تابعین، محدثین اور فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے دین اسلام کی تعلیمات کو آگے پہنچایا اور پھیلایا جو اظہر من الشمس ہے، پھر یہ سلسلہ غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم سے ہوتا ہوا ہندوستان کے چپے چپے پر پہنچا، پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے تکوینی احسانات کی بدولت صحیح تعلیمات اسلامیہ کا مرکز دارالعلوم دیوبند بنا۔ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے پوری دنیا میں دین اسلام کی صحیح تعلیمات کو تقریر وتحریر، تبلیغ وتصنیف کے ذریعہ پہنچایا والحمدللہ علیٰ ذالک.

بالخصوص حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی..... حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی..... شیخ الہند حضرت

مولانا محمود حسن.....حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی.....امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری.....شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی.....مفتی ہند حضرت مولانا کفایت اللہ.....شیخ المشائخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری.....شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی.....قطب الاقطاب وقطب الہند شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی.....امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین جو جبال علم ہونے کے ساتھ ساتھ رشد وعلم وہدایت کے روشن آفتاب وماہتاب تھے۔ یہاں ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ آج کل علم وعمل میں فتنوں کا دور دورا ہے اس لئے اپنے آپ کو فتنوں سے بچانے کے لئے اور صحیح اہل سنت والجماعت بننے کے لئے انہی مذکورہ بزرگ شخصیات کی تعلیمات کو اپنانا ہے، یہی راستہ اولیائے کرام، فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ہوتا ہوا نبی رحمت احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہونچتا ہے۔

الحمد للہ! اللہ پاک نے وطن عزیز ملک پاکستان کو بھی ایسی عبقری شخصیات سے نوازا ہے، جن کا قول وفعل علم وعمل قابل نمونہ ہے یہ بھی ہم پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا بہت بڑا احسان عظیم ہے ان میں چند اہم شخصیات یہ ہیں: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری.....شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی.....شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک.....مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع.....حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی.....شیخ الحدیث حضرت علامہ سرفراز خان صفدر.....حضرت مولانا مفتی محمود.....حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی.....قائد اہل سنت وکیل صحابہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین وغیرہ۔

حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری بنوری ٹاؤن کراچی نے اپنے ملفوضات میں ایک اہم نکتہ ارشاد فرمایا ہے کہ جس مسلک میں حضرت مولانا علامہ سرفراز خان اور حضرت مولانا قاضی مظہر حسین (رحمۃ اللہ علیہم) متفق ہوں وہی میرا مسلک ہے احقر کا بھی الحمد للہ یہی نظریہ ہے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہم سب کو انہی بزرگوں کے طفیل دنیا اور آخرت میں کامیابی نصیب فرمائے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی ضروریات کی تکمیل کا سروسامان بھی کیا، وہ اس طرح کہ ایک تو خود اسے بھی عقل وشعور سے نوازا اور دوسرے نمبر پر ساری کائنات کو اس کی خدمت پر لگا دیا۔ یہ سب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کی عطا کردہ نعمتیں اور اس کے احسانات ہیں، یہ نعمتیں اور احسانات ان گنت ہیں، یعنی اتنے ہیں کہ انہیں شمار بھی نہیں کیا جا سکتا، جیسے رب ذوالجلال نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو، تو اُنہیں شمار نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔" (النحل۔ آیت نمبر ۱۸)

ان ان گنت نعمتوں اور بے پایاں احسانات کے بدلے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ انسان سے کیا چاہتا ہے؟ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ چاہتا ہے کہ انسان صرف اسی ایک اللہ کی عبادت کرے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کا مقصدِ تخلیق اپنے کلام میں یہی بیان کیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریات، آیت نمبر ۵۶)

"اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔"

ایک فارسی کے شعر میں اس بات کو اس طرح ادا کیا گیا ہے:

ابر و دو مہ و خورشید و فلک درکار اند　　تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار　　شرط انصاف نباشد کہ تو فرمانبری

''یعنی بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان سب خدمت میں لگے ہوئے ہیں تا کہ تجھے روٹی میسر آجائے اور تو غفلت کا ارتکاب نہ کرے سب تیرے لئے سرگرم اور فرمان الٰہی کی بجا آوری میں مصروف ہیں یہ انصاف کی بات نہیں ہوگی کہ تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی فرمانبرداری کا مظاہرہ نہ کرے۔''

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے ہمیں توحید کا درس دیا، ہم نے توحید کے لبادے میں بھی شرک کے پیوند لگا لئے، شرک وہ واحد عظیم گناہ ہے جس کی بخشش نہیں، اور ہم یہی گناہ کئے جا رہے ہیں، ہماری عبادات: نماز روزہ، زکوٰۃ، حج محض نمود و نمائش کی چیزیں بن کر رہ گئی ہیں، یہ کیسی عبادات ہیں جن کی ادائیگی کرنے کے بعد بھی ہماری زندگیاں اخلاص سے خالی ہیں، ہر معاملے میں جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے، فریب ہمارا کاروبار بن کر رہ گیا ہے اسکے نتیجے میں ہماری زندگیوں سے امن وچین رخصت ہو چکا ہے، ہر طرف فتنہ وفساد ہے، ناچاقی اور جھگڑے ہیں۔ ہمارے انفرادی اور اجتماعی بگاڑ کا سبب یہی ہے کہ ہم قرآن وسنت سے روگردانی کر رہے ہیں، قرآن وسنت سے دوری ہی ہمیں تباہی کے قریب لے جا رہی ہے۔ ہماری سلامتی کا واحد راستہ یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے قرآن نبی کریم ﷺ کے فرمان کو سمجھیں اور اس پر دل وجاں سے عمل پیرا ہوں۔

اسی سلسلہ میں ہمارے مکرم، محترم دوست حضرت قاری حافظ محمد اکرام صاحب اطال اللہ عمرہٗ وزید سعیہٗ وعلمہٗ کی ایک بہترین کاوش اور محنت ہے، جن کا ماشاء اللہ تصنیفی ذوق قابلِ قدر اور لائق تحسین ہے اللّٰھم زد فزد ولا تنقص۔ جس کو نوجوان حضرات کے لئے ایک نئے عام فہم اور دلنشین انداز سے مختصر مختصر، مختلف عنوانات کے ذریعہ تعلیمات اسلام کو قلم بند کیا ہے۔ جس میں عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاقیات کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں بہت کچھ آگیا ہے، بمطابق مثل مشہور ''دریا کو کوزہ میں بھر دیا ہے۔'' جس کا نام ''مسلمان کی طرزِ زندگی قرآن حکیم کی نظر میں'' رکھا ہے۔ جس کو نوجوان نسل کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے جمع کیا گیا ہے جس کی آج کل سخت ضرورت تھی، چونکہ آج کل کا عام نوجوان بے راہ روی میں بہت آگے جا چکا ہے اور پر مستزاد یہ کہ ٹی وی، موبائلز، کیبل اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال نے بالکل ستیاناس کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہی حفاظت فرمائے، امید ہے کہ یہ کتاب ان شاء اللہ ہم سب کو فائدہ دے گی اسی فکر و درد کے لئے موصوف نے یہ محنت فرمائی ہے۔ احقر کی نوجوان نسل سے درخواست ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ ایک بار ضرور کریں، شاید کے اسکے مطالعے کے نتیجے میں کسی کے دل میں علم وعمل اور محنت کی خوابیدہ چنگاری بیدار ہو جائے۔ موصوف کی اس تصنیف سے مخلوقِ خدا کو مستفید و مستفیق ہونے کی توفیق عطا فرمائیں، اللہ رب العزت موصوف کو مزید ایسی ہی خدمات کی توفیق نصیب فرمائے اور اس کو دنیا و آخرت کی کامیابی وکامرانی کا ذریعہ بنادے۔ (آمین)

احقر محمد شفیق عفی عنہ

خادم الحدیث جامعہ عربیہ اظہار الاسلام ومکی جامع مسجد چکوال

۵ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ شب یوم الجمعہ

تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمان قرآن کریم کا بطور خاص مطالعہ کرتے اور اس پر عمل کرتے رہے اس وقت تک دنیاوی سربلندی حاصل کرتے رہے۔ آخری حج کے موقع پر حضور اقدس ﷺ نے جو خطبہ دیا وہ انسانی تاریخ کا سب سے قدیم اور جامع چارٹر ہے، اس خطبہ میں جناب نبی کریم ﷺ نے بطورِ خاص تاکید فرمائی ہے کہ: ''میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہو گے، وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم۔''

اسی لئے مسلمانوں کیلئے عظمت کا راز صرف قرآن حکیم کے ساتھ وابستگی میں ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں سائنس اور معقولات میں جو کچھ بھی ترقی کی وہ بھی قرآن حکیم ہی کی ہدایت کا نتیجہ تھی۔ اس لئے کہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ کائنات کو انسانوں کیلئے تسخیر کیا گیا ہے، اس لئے ان کا فرض ہے کہ اس کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کریں اور ایک جانب کائنات کے ذرے ذرے کو انسانی فلاح و بہبود کے کام میں لائیں اور دوسری جانب خالق کائنات کی تسبیح کریں اور اس کا شکر ادا کریں کہ اس نے کس قدر بے شمار نعمتیں انسان کیلئے پیدا کی ہیں۔

قرآن حکیم ایمان کا سرچشمہ اور عمل کا مرکز ہے، وہ اپنے ماننے والوں کو بتاتا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ رہیں اور صرف آخرت کا نعرہ لگا کر دنیاوی سربلندی کے حصول میں کوتاہی نہ کریں، یہ دنیا بھی ان کیلئے ہے اور آخرت بھی۔

قرآن کریم سے مسلمانوں کا تعلق بالکل ویسا ہی ہے، جیسا جسم کا جان سے، قرآن نہیں تو اسلام نہیں۔ اگر قرآن کریم کو مسلمان حرزِ جان نہ بنائے تو وہ اسلام کی تعلیمات سے بے بہرہ اس آدمی کی طرح ہے جو اندھیری رات میں ادھر ادھر بھٹکتا پھرے اور اسے نشانِ راہ اور منزل مقصود نظر نہ آئے۔ قرآن نہیں تو مسلمان روحِ اسلام سے محروم ہے۔ قرآن نہیں تو رشد وہدایت نہیں، قرآن حکیم دینی اور دنیاوی تعلیمات کا الٰہی مجموعہ ہے، یہ انسانوں کی ہدایت کیلئے نازل کیا گیا تاکہ وہ اسے پڑھیں، اس پر غور کریں اور کائنات کے حقائق کو سمجھیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اور اس کے رسول ﷺ کی اس طرح اطاعت کریں کہ دنیا میں سربلندی حاصل ہو اور آخرت میں بھی نجات وثواب کے مستحق ہوں۔ قرآن حکیم سے مسلمانوں کا تعلق ایسا ہے کہ اس کے بغیر گویا وہ گمراہی کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے، قرآن حکیم مسلمان کی روح ہے، اس کی جان ہے، اس کا ایمان ہے، اس کا مان ہے، اس کی فلاح و بہبود کا وسیلہ ہے، سربلندی اور خوش حالی کا یقینی ضابطہ ہے، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اس امت کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو قرآن کو پڑھتی اور اس پر عمل کرتی ہے، قرآن راہِ راست دکھاتا ہے، فقیروں کو بادشاہ بنا دیتا ہے، جاہلوں کو عالم وفاضل بنا دیتا ہے، انسانوں کو ان کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے، اور کائنات کے رازہائے سربستہ ان پر منکشف کرتا ہے۔

اس ہدایت کی روشنی میں قرآن پاک سے مسلمانوں کا جو تعلق ہونا چاہیئے وہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمان اور قرآن لازم وملزوم ہیں۔ قرآن شریف بھی اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی ایسی نعمتوں میں سے ہے کہ اس میں بندوں کیلئے جو بھی سامانِ رشد وہدایت ہے اور ان کے دلوں کی بیماریوں کیلئے جو بھی سامانِ شفا ہے۔ اس سے نہ تو زمان ومکان کی تخصیص ہے، نہ نسل وقوم کی تحدید ہے بلکہ یہ قرآن حکیم سارے انسانوں اور ساری قوموں کیلئے ایک ابدی نعمت ہے۔

قرآن مجید وفرقان حمید میں انسانوں کیلئے سرچشمۂ ہدایت ہے، وہ جامع ومانع اور ایک مکمل قانون ہے، ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کی روشنی میں ہم اپنی زندگیوں کو گذاریں اور زندگی کی راہوں کو قرآن وسنت کے ذریعے ہموار کریں۔

اسلام کا منشا یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں زندگی اس طرح گذارے کہ وہ قدرت کی عطا کی ہوئی تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہو، مگر اس کے ساتھ اس دنیا کا بھی خیال رکھے جہاں انسان کو بالآخر جانا ہے اور ہمیشہ رہنا ہے، جہاں کی زندگی

اصلی اور دائمی زندگی ہے۔قرآن کریم اسی بنا پر انسان کی تمام سرگرمیوں اور افعال کیلئے کچھ حدود مقرر کرتا ہے اور ایک دائرہ کھینچ دیتا ہے، اس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہے، معاش ہو یا جنس، سیاست ہو یا تجارت حدود کی پابندی لازمی قرار دی گئی ہے، ان پابندیوں کا مقصد یہ ہے کہ انسان وقتی خواہشات اور عارضی کشش کے پیچھے توازن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، جس کے نتیجے میں انسان سے اس کا سکون واطمینان چھن جاتا ہے اور وہ اضطراب وانتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

کیونکہ دل کا اطمینان وہ متاع گراں بہا ہے جس کی تلاش میں ہر انسان رہتا ہے اور جس کو حاصل کرنا ہر ایک کی سعی و جہد کا مقصود ہوتا ہے، دل کے اطمینان کیلئے انسان اپنی ساری زندگی کوشاں رہتا ہے اور اس کے مل جانے کے بعد دنیا کی ہر دولت سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے۔اگر کسی کو دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہوں، ہر قسم کی سہولتیں اس کو میسر ہوں لیکن اس کو اطمینانِ قلب حاصل نہ ہو تو وہ کسی نعمت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا اور ہر سہولت اس کیلئے بے فائدہ ہے، اطمینانِ قلب اگر میسر ہو جائے تو سمجھئے کہ تمام کوششیں کارگر ہوئیں اور زندگی بامقصد ہو گئی۔

اس لئے اطمینانِ قلب کیلئے خدا، رسول اور آخرت پر ایمان کے ساتھ قرآن پر عمل بھی ضروری ہے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں قرآن پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور اطمینان وسکون کی دولت سے مالا مال فرما کر خاتمہ بالایمان فرما دیں۔آمین

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر اس میں کیا ہے، کہ نقل انگریز کر

قارئین کرام سے نہایت ہی ادب واحترام سے درخواست کی جاتی ہے کہ کتاب کا مطالعہ عمل کرنے اور ہدایت کی نیت سے کیا جائے تو ان شاء اللہ اس حسنِ نیت سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ عمل کی بھی اور اس کو پھیلانے کی توفیق بھی نصیب فرمائیں گے۔ایک اور گزارش یہ بھی کی جاتی ہے کہ اپنی دعاؤں میں ان تمام بزرگوں اور اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کو یاد رکھیں جن کی کتابوں سے یہ کتاب تیار کی گئی ہے، بالخصوص استاذی المکرّم واستاذ العلماء جناب مولانا محمد شفیق صاحب دامت برکاتہم العالیہ جنہوں نے بندہ کی بے ربط وبے ترتیب مضامین کے مجموعے پر مقدمہ تحریر فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی اور اس کتابچے کی زینت میں اضافہ فرمایا، اسی طرح دیگر اساتذہ کرام، میرے والدین اور کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں، بفضلِ الٰہی بندہ ان ہی کی دعاؤں اور محنت سے پڑھنے لکھنے کے قابل ہوا اور اس کاوش کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکا، دوسروں کے لئے دعا کرنے سے فرشتے ہمیں دعا دیتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جو مسلمان اپنے بھائی کے پیٹھ پیچھے (غائبانہ) اس کے لئے دعا کرے۔تو ایک فرشتہ کہتا ہے تیرے لئے بھی ایسا ہی ہو“

دعا گو ودعا گو!

محمد اکرام غفرلہٗ خادم ومدرس!

مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال ضلع چکوال موبائل نمبر 0333-5902896

اساسِ اسلام

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝ کہہ دو: ”بات یہ ہے کہ اللہ ہر لحاظ سے ایک ہے۔ (سورۃ الاخلاص)

اللہ ایک ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے، عقیدۂ مسلم کی یہی بنیاد ہے، دین کی یہی اساس ہے، اسی مقام سے دین کا پہلا قدم اٹھتا ہے اور اسی مقام پر اس کا آخری قدم پڑتا ہے۔ یہی دین کا دائرہ ہے، اور دین اس وقت تک محفوظ ہے جب تک وہ اس دائرے کے اندر ہے۔ توحید دین کا صرف ایک جزو نہیں ہے، توحید دین کا ایک ٹکڑا نہیں ہے بلکہ توحید سارے دین کو محیط ہے توحید سے باہر دین کا کوئی تصور نہیں اللہ تعالیٰ کے سارے انبیائے کرام اسی نکتے اور نقطے سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور اسی مقام پر ختم کرتے ہیں۔ اسلام ہمارا دین ہے، اس دین کا ایک نظام ہے، اور اس نظام کی بنیاد اور اساس توحید ہے یعنی اللہ کو ایک واحد ماننا اور تسلیم کرنا، دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے، نظام دین میں توحید کو وہی جگہ اور مقام حاصل ہے کہ جو جسمِ انسانی میں دل کو حاصل ہے۔ جیسے ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ و آشنا ہیں کہ اگر دل بیمار اور ضعیف ہو جائے تو انسانی جسم بھی بیمار و بے کار ہو جاتا ہے، لیکن اگر دل صحت مند ہے اور اچھا ہے تو انسان کا جسم بھی صحت مند اور تندرست ہوگا، اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں آجاتی ہے تو آپ کو بڑی آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کے نظام سے توحید کو اگر الگ کر دیا جائے تو پھر یہ نظام ہی باقی نہیں رہے گا۔

سارے انبیائے کرام علیہم السلام نے ہمیشہ اور ہر حال میں اپنی دعوت کا آغاز توحید سے کیا ہے۔ دعوتِ توحید کی مخالفت ہر دور میں ہوئی ہے، شدید سی شدید مخالفتوں نے سر بلند کیے، مگر اللہ کے ان عظیم و جلیل بندوں نے ان مخالفتوں کی ذرہ برابر پروانہ کی اور عظیم تر قربانیاں دے کر بنی نوع انسان کیلئے ایک سیدھا راستہ متعین کر دیا۔ یہ صراطِ مستقیم توحید سے عبارت ہے۔

ہمیں یقین کرنا چاہیئے، باور کرنا چاہیئے کہ سب سے بڑا حق، اللہ کے حق کا اقرار ہے، توحید اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے حق کا اقرار ہے۔ سارے حق و انصاف اور عدل و قسط کی یہی بنیاد ہے، جو انسان اس حق کو نہیں پہچانتا وہ کسی کے حق کو بھی نہیں پہچان سکتا، یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کے حق کو بھی نہیں پہچانتا۔ انسان جب اس فہم و ادراک سے محروم ہوتا ہے، تو انصاف سے دور اور ظلم و تعدی سے قریب ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے ظالم اور ناشکر گزار انسانوں سے جو ناانصافیاں اور مظالم ظہور میں آرہے ہیں وہ اس صورتِ حال کی مثال ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اور دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے، اگر دین کو ایک جسم تسلیم کر لیا جائے تو اس جسم کی روح توحید ہے، اگر دین کو آنکھ کہا جائے تو اس کا نقطۂ توحید بصارت توحید ہے۔ اللہ ایک ہے، اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

توحید

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ (النحل۔۲)

"لوگوں کو آگاہ کردو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو، (کسی اور سے نہیں)۔"

توحید فطرت کا تقاضا ہے اور ایک ایسا عقیدہ ہے جو ہر آئین کی رو سے مسلم ہے، دنیا کے پہلے بشر یعنی حضرت آدم علیہ السلام بھی موحد تھے اور انہوں نے توحید ہی کی تعلیم دی۔ تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں کو توحید ہی کی تعلیم دی اور تاکید کی کہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ایک مانیں اور نبی آخر الزمان ﷺ نے اس توحید کی عظیم ترین حقیقت کے سارے پہلو اپنی امت کے سامنے مکمل طور پر واضح کر دیئے اور سختی کے ساتھ اسی عقیدے پر قائم رہنے کی تاکید فرمائی، بلکہ لوگوں کو اس کی تبلیغ و تلقین کرنے کا بھی حکم دیا۔

اقوام وملل اور ادیان ومذاہب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ توحید ایک عالمگیر تعلیم ہے۔ مگر امتوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کی اس عالمگیر تعلیم کو کبھی تو فراموش کر دیا، کبھی اس کی صورت بگاڑ دی، اس لئے قرآن مجید نے اس اساسی عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا اور نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت کو ہر اس بات سے روکا جس سے مسلمانوں کی انفرادی یا اجتماعی زندگی میں شرک کے در آنے کا امکان تھا۔

کیونکہ اسلام کا پہلا اور اساسی عقیدہ توحید ہے، دوسرے سارے عقائد اور سارے اعمال اسی پر مبنی ہیں۔ اگر توحید اپنی حقیقی صورت میں موجود ہے تو رسالت وحی اور آخرت پر ایمان بھی درست ہے، اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے اعمال بھی نتیجہ خیز اور ثمر آفریں ہیں۔ قرآن پاک میں سب سے زیادہ آیات توحید ہی کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ اسلام جن عقائد و افکار کی بنیاد پر نظامِ زندگی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کی حقیقی روح توحید ہی ہے۔

توحید کی تشریح سادہ الفاظ میں یہ کر سکتے ہیں کہ توحید کا مطلب قولاً اور عملاً اللہ کو ایک ماننا ہے اور اسی کی عبادت کرنا، اس کے سامنے جھکنا، اس سے مدد مانگنا، اس کے حضور عاجزی اور التجا کرنا، اس کی بارگاہ میں دستِ سوال دراز کرنا خالق و مالک اس کو سمجھنا، اس کے قانون کو قانون ماننا اور نفع ونقصان کو اس کی جانب سے سمجھنا ہے اور مختصر یہ کہ اس کی عبادت اور بندگی میں کسی کو کسی حیثیت سے اور کسی درجے میں شریک نہ ٹھہرانا، عقیدۂ توحید کی مکمل صورت ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو وہ جنت میں جائے گا۔" (مسلم شریف)

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم قرآن وسنت کی تعلیمات پر عمل کرنے والے بن جائیں۔

UMAR SHAHEED LIBRARY Mohra Kor Chashm (Chakwal) Pakistan
عمر شہید لائبریری موہڑہ کور چشم (چکوال) پاکستان

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ایک ماننا

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ۝ (الانعام۔۱۹)

کہہ دو کہ: ”وہ تو صرف ایک خدا ہے، اور جن جن چیزوں کو تم اس کی خدائی میں شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سب سے بیزار ہوں۔“ (الانعام۔۱۹)

تمام انبیائے کرام علیہم السلام جو اس دنیا میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ان کی دعوت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم جزو یہ تھا کہ اس مالک حقیقی کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ایک ماننا اور اس کی وحدانیت پر ایمان اسی وقت اہم ہو سکتا ہے جب ہم اس کو تمام صفات کے ساتھ مانیں یعنی اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی جملہ صفات کے ساتھ اس کو واحد تسلیم کریں تو اس سے ہماری زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوگا۔ ورنہ کسی بت کو ایک ماننے اور اللہ رب العزت کو واحد ماننے میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

لا الٰہ الا اللہ کہنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کائنات میں کوئی الٰہ نہیں ہے بس ایک اللہ ہی اللہ ہے، قرآن حکیم نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی صفات بتادی ہیں، ورنہ جہاں کہیں خدا کا تصور موجود ہے وہاں بھی اللہ کی مکمل صفات کے ساتھ نہیں ہے۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ یعنی بندگی کا مستحق وہ ہو سکتا ہے جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے، وہ کسی کا محتاج نہ ہو، اس کی قدرت کی کوئی انتہا نہ ہو، اس کے تمام کام حکمت کے ساتھ ہوں، وہ سب پر غالب ہو، وہ سب کچھ جانتا ہو، ہر چیز اس کی پیدا کردہ ہو، اس کے کسی کام میں کوئی دوسرا دخل نہ دے سکتا ہو۔ اس کے کسی کام میں کوئی نقص نہ ہو، وہ مجسم عدل ہو، وہ ہر قسم کے نفع ونقصان پر قادر ہو، سزا و جزا کا اس کو پورا پورا اختیار ہو، ہر ایک کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہو اور اس کا کوئی شریک اور ساتھی نہ ہو، اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کی ان صفات کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہنے والا انسان کبھی مایوس نہیں ہوتا، اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا اللہ بے حد کریم ہے اور زمین و آسمان کے تمام کھلے چھپے خزانوں کا مالک ہے، اللہ چاہے گا تو دنیا کی تمام نعمتیں اور راحتیں اس کو میسر آجائیں گی اور تمام مشکلات چٹکی بجاتے میں دور ہو جائیں گی۔ اسی طرح ایک توحید پرست یعنی اللہ کو ایک ماننے والا بے حد نڈر اور بے خوف ہوتا ہے، ایک خدا کا خوف اس کے دل سے تمام دوسرے خوف نکال دیتا ہے، وہ بہادر اور جری ہوتا ہے، وہ بزدل نہیں ہوتا، عقیدہ توحید انسان کو خوددار اور خود اعتماد بنا دیتا ہے، کیوں کہ وہ ایک اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکنا پسند نہیں کرتا، وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا، لیکن اس کے ساتھ وہ مغرور بھی نہیں ہوتا بلکہ منکسر المزاج ہوتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ایک مسلم معاشرے کو دوسرے تمام معاشروں سے ممتاز کرتی ہے۔

وحی کے اتباع کی ضرورت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ ۙ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف۔۱۵۷)

چنانچہ جولوگ اُس (نبی) پرایمان لائیں گے، اُس کی تعظیم کریں گے، اُس کی مدد کریں گے، اور اُس کے ساتھ جونوراتارا گیا ہے، اُس کے پیچھے چلیں گے، تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔ (الاعراف۔۱۵۷)

اس آیت مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کے اتباع اور وحی لانے والے یعنی رسول (ﷺ) کی پیروی کی راہ ہی انسان کیلئے راہِ نجات ہے۔

آج امت مسلمہ پر زبوں حالی چھائی ہوئی ہے اور آج ہم ہر طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، ہماری یہ حالت ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں میں بھی محفوظ نہیں ہیں اور ہماری انفرادی واجتماعی زندگیوں میں مومن کی شانِ امتیاز جسے قرآن وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرہ۔۱۱۲) کا عنوان دیتا ہے، مفقود ہے۔ ہم اپنی زندگی اور اپنے ملکوں اور اپنے گھروں کی حفاظت کیلئے بھی دوسروں کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں اور ہم نے باوجود کثرت تعداد کے اور باوجود کثیر وسائل کے آج اقوامِ عالم کی صفوں میں پست ترین مقام اپنے لئے انتخاب کر لیا ہے اور امامتِ اقوام کے منصب سے اتر کر دوسروں کے دستِ نگر اور ان کی چشم وآبرو کے اشاروں پر چلنے والے، اغیار سے تحفظات کی بھیک پر گزارا کرنے والے بن گئے ہیں تو اس ساری نکبت و خواری کا سبب یہ ہے کہ آج ہم نے وحی کے اس سراجِ منیر کو توڑ ھانک کر ایک طرف رکھ دیا ہے، جس کی روشنی ہمارے لئے راحت روح اور حیات بخش ہوتی اور ایسی اقوام وملل کو اپنا راہنما بنا لیا ہے جو خود گم کردہ راہ ہیں۔

ہماری اس بدنصیبی کا کوئی ٹھکانہ ہے کہ ہم نے انہیں اپنا محافظ اور قائد سمجھ لیا ہے جو فی الحقیقت ہم سے راہنمائی کے محتاج ہیں۔ اگر ہم ان ہی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے چلتے رہے اور اس یدِ بیضا سے ہم نے صرفِ نظر کر لیا جو "اللہ نور السمٰوٰت والارض" نے ہماری آستینوں میں دے رکھا ہے تو دنیا میں تو تباہ ہوتے ہی رہیں گے، بربادیوں کی ذلتوں سے ہر روز ہمیں سامنا رہے گا اور اس کے ساتھ قیامت میں جب ہم اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گے تو یہ ذلت وہاں بھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑے گی، ہم اپنی بے راہ روی پر اور اپنے خود ساختہ اماموں پر لعنت کرتے رہیں گے اور اللہ کی لعنت ہم پر مسلط رہے گی۔ یہ محض اللہ کا فضل واحسان ہے کہ اس گئی گذری حالت کے باوجود اس نے ہمارے بارے میں ابھی یہ فیصلہ نہیں فرمایا کہ وحی کی روشنی سے روگردانی کرنے والی اس قوم کے دلوں پر مہر لگا دی جائے۔ ابھی اللہ کی دی ہوئی مہلت باقی ہے اگر ہم میں سے ہر فرد اور ساری ملت اسلامیہ یہ طے کر لے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھانا ہے اور وحی کی روشنی کو اپنا راہ نما بنانا ہے تو حالات کو بدلتے دیر نہیں لگے گی۔ ہم اپنی کھوئی ہوئی عزت آج بھی واپس لے سکتے ہیں بشرطیکہ وحی پر ایمان کی تجدید کریں، وحی بھیجنے والے اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کا دامن تھام لیں اور وحی لانے والے رسول کی قیادت میں خود کو منظم کر لیں۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے اور ہمارے دن پھیر دے۔ (آمین)

تصورِ آخرت کا اثر اعمال پر

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ (المدثر۔۵۳) ہرگز نہیں! بات اصل میں یہ ہے کہ ان کو آخرت کا خوف نہیں ہے۔

عقائد و ایمانیات میں تین عقائد بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔(۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالرسول (۳) ایمان بالآخرت۔ مذکورہ آیت آخرت کا جو تصور و ایمان دیتی ہے، یہ ایسا تصور و ایمان ہے کہ اگر ہر وقت ذہن میں رہے تو ناممکن ہے کہ انسانی اعمال پر اس کا اثر نہ پڑے، ایسا انسان جو آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے طرزِ ماند و بود، نشست و برخاست، بول چال، عادات و اطوار سلوک اور چلن، حتیٰ کہ اس کی گفتگو اور خاموشی، اس کے مختلف امور میں دل چسپی لینے یا ان سے بچنے تک سے یہ عیاں ہوگا کہ یہ وہ آدمی ہے، جو اس کائنات کے مالک اور حاکم اور اس کے نظام کو چلانے والے اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان رکھتا ہے اور اس نے پوری دلجمعی اور اطمینان قلب کے ساتھ اللہ کے نبی کو اپنا قائد و راہنما اور مطاع قرار دیا ہے اور وہ شخص کہ جو آخرت پر یقین و ایمان رکھتا ہے، وہ لازماً اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس دنیا میں کی ہوئی کوئی نیکی اکارت نہیں جائے گی اور کوئی بدی ایسی نہیں جس کے نتائج کا کل کی زندگی میں اسے سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

آپ خود سوچئے کہ ان تصورات کا حامل اگر کوئی فرد ہو تو کیا وہ اندھیرے میں ہیرے کی طرح دمکتا نہ محسوس ہوگا۔ اور اگر کوئی ملت ہو تو وہ اس اندھیری دنیا میں ظلمتوں کے اس سیلاب میں مینارہ نور نہ معلوم ہوگی۔ آج ملتِ اسلامیہ کے افراد اور ان افراد کی وجہ سے ساری ملت پر جو نکبت و بدحالی طاری ہے اور جو بے وقعتی مشرق سے لے کر مغرب تک ہمارا مقدر بن گئی ہے اس کی وجہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ آج ہمارے اعمال اہلِ ایمان اور ہدایت ربانی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے والے اہلِ اسلام کے سے اعمال نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا اور اس کے بعد کی زندگی کے بارے میں ہمارا تصور وہ نہیں رہا جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا، جیسے رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا اور جس کی توضیح و تشریح کتابِ ہدایت نے کی ہے۔ اگر ہم بحیثیت فرد اور بحیثیت ملت و جماعت کے اس تصورِ آخرت کو دوبارہ اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیں تو ہم اپنے اعمال کے آئینے میں دنیا کو وہ خاکہ دکھا سکتے ہیں جسے سامنے رکھ کر اگر انسانیت اپنی زندگی کی راہ متعین کر لے تو ابدی نجات اس کا مقدر بن جائے۔ اس تصور کو تازہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو حرزِ جان بنا لیں اور ان راہوں کو اختیار کریں اور ان راستوں پر چلیں جن کی راہنمائی ہادیٔ برحق، نورِ مجسم ﷺ نے فرمائی ہے۔

رب نے کہا کل من علیھا فان

یہی ہے ہر مسلمان کا ایمان

انسان کی زندگی کا مقصد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریات۔۵۶)

"اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔"

اس آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے انسانی زندگی کا ایک مقصد متعین کر دیا ہے اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ خالق حقیقی کا مقصد انسان کو پیدا کرنے سے یہ ہے کہ وہ عبادت کرے، یہی وہ مقصد ہے جو قرآنی نقطۂ نظر سے حیاتِ دنیوی کا تصور واضح کرتا ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ہر کام ہر فعل عبادت ہو سکتا ہے، اگر وہ کچھ حدود کے اندر رہ کر انجام دیا جائے، یہ تصور ہمیں زندگی کے ایک وسیع تر مفہوم سے آشنا کرتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں عبادت کا تصور اسلام سے قبل یہ تھا کہ کچھ مقرر شدہ اوقات میں کسی مخصوص جگہ اور مخصوص انداز سے مقررہ رسوم ادا کر دینے سے انسان عبادت کے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ اسلام نے انسان کو پہلی بار یہ بتایا کہ عبادت صرف مسجد ہی میں نہیں ہوتی، عبادت دکان میں بھی ہو سکتی ہے، درس گاہ میں بھی ہو سکتی ہے، سفر میں بھی ہو سکتی ہے، حضر میں بھی ہو سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان اپنے کو عبد سمجھے اور اپنے معبود کی خوشنودی اور رضا کو ہمیشہ اور ہر وقت پیش نظر رکھے۔ معبود حقیقی نے جو حدود انسان کیلئے مقرر کر دی ہیں ان حدود کے اندر رہ کر، ان حدود کی پابندی کرتے ہوئے وہ جو کام بھی کرے گا، وہ عبادت ہوگا، چاہے وہ حصول معاش کیلئے ہو یا کسی غریب الوطن کی ہمدردی کیلئے۔

اسلام اس دنیا کو عارضی قیام گاہ بتاتا ہے، اور اس کو ابدی زندگی کی تیاری کی جگہ قرار دیتا ہے، اس لئے وہ انسان جو اسلام پر ایمان رکھتے ہیں دنیا کی زندگی میں شتر بے مہار نہیں ہو سکتے۔

سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ .

"یعنی دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کیلئے پیدا کئے گئے ہو۔"

نبی محترم ﷺ کے ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ تمہارے لئے ہے تم اس سے متمتع ہو اور فائدہ اٹھاؤ مگر دنیا کے ہو کر نہ رہ جاؤ، بلکہ یہ سمجھ کر دنیا میں رہو کہ اصلی زندگی آخرت کی زندگی ہے اور وہی دائمی زندگی ہے۔ دنیا میں اگر ہم صحیح اعمال اختیار کریں گے اور خدا اور رسول کے احکام کے مطابق چلیں گے تو آخرت کی زندگی میں کامیابی حاصل ہوگی اور اگر اس زندگی میں احکامِ الٰہی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کریں گے تو ناکامی سے دوچار ہوں گے۔

لہٰذا اس تصور کو ذہن میں رکھ کر جو زندگی گذاری جائے گی وہ انتشار و افتراق سے پاک ہوگی، استحصال سے منزہ ہوگی۔ اس زندگی میں امن و سکون، آرام و راحت ہوگی، خوشی و خوشحالی ہوگی۔

ایمان کی روشنی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ (الشوریٰ۔۵۲)

''تمہیں اس سے پہلے نہ یہ معلوم تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اس (قرآن) کو ایک نور بنایا ہے جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔''

ایمان کے متعلق خاتم الانبیا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''ایمان نام ہے کچھ فرائض کی تکمیل کا، بعض قوانین واحکام کی پابندی کا اور کچھ تعلیمات کی پیروی کا۔ تو جس نے ان امور کی تعمیل کی اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا اور جو ان سے عاجز رہا، اس کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔'' حق یہ ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، یہ نعمت دوسری نعمتوں کی طرح ایک آزمائش ہے۔ انسان کی دنیوی زندگی ایک امتحان ہے، ایک طرف زندگی کی آسائشیں اور راحتیں ہیں، دوسری جانب مصیبتیں اور پریشانیاں ہیں، دونوں صورتوں میں انسان کو سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، ان آزمائشوں سے انسان کو جو چیز کامیابی اور خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بخشتی ہے وہ ایمان کی قوت ہے اگر انسان یقین وایمان سے خالی ہو تو وہ نہ صرف یہ کہ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ نہیں کرسکتا، بلکہ زندگی کی راحتوں سے بھی صحیح معنی میں لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ ایمان کی عدم موجودگی بے مقصدی کے مترادف ہے۔ ایمان سے عاری انسان ایک ایسے مسافر کی مانند ہے جو تنگ وتاریک راستوں کی صعوبتیں تو برداشت کررہا ہو، لیکن منزل معلوم نہ ہونے کی بنا پر منزل پر پہنچنے کے لطف کے تصور سے محروم ہو، زندگی کی کٹھن راہوں میں، مسائل کی پیچیدگی میں، وسائل کی کمی میں جو روشنی انسان کو بھٹکنے سے بچاتی ہے، جو روشنی اس کے عزم کو بلند رکھتی ہے، وہ روشنی ایمان کی روشنی ہے۔ ایمان ایک ایسی روشنی ہے کہ جو مایوسی اور مشکلات کی رات میں صبح کے نور کی طرح ہے۔

اب اس شخص کی بدنصیبی اور حرمان بختی پر غور کیجئے جو نہ خود کو جانتا ہو، نہ خدا کو پہچانتا ہو، نہ اسے یہ معلوم ہو کہ اس کائنات کا، خالقِ کائنات سے کیا تعلق ہے؟ اس کی یہ لاعلمیاں اور جہالتیں کتابِ ہدایت کے الفاظ میں '' ظلمات م بعضھا فوق بعض ط اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا '' یعنی تہہ در تہہ اندھیرے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے کی مصداق ہیں۔

قرآن حکیم کا مقصد نزول کفر کی تاریکی کو ایمان کی روشنی میں بدل دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۵ (ابراہیم۔۱)

یعنی ''(اے پیغمبر!) یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، تاکہ تم لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آؤ۔''

حضرت رسول اکرم ﷺ نے ایمان کی اصل چھ چیزیں قرار دی ہیں۔ ☆ اللہ پر ایمان لانا ☆ اللہ کے فرشتوں پر ایمان لانا ☆ اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا ☆ اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان لانا ☆ قیامت کے دن پر ایمان لانا ☆ تقدیر پر ایمان لانا۔

ایمان شرعی کے متعلق تمام محدثین کا مذہب یہ ہے کہ دل سے ماننا زبان سے اقرار کرنا، اور اعضا سے عمل کرنے کا نام ایمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان اللہ کے پیغمبر پر اس کے لائے ہوئے مکمل پیغام کے بارے میں کامل اعتماد کا نام ہے۔

ایمان اور یقینِ محکم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (النسآء۔۱۳۶)

یعنی ''اے ایمان والو! اللہ پر ایمان رکھو، اور اس کے رسول پر''

یہاں ایمان کے باوصف دوبارہ جس بات کا حکم دیا جا رہا ہے، وہ یقین محکم ہے۔ یہ ایک اصولی بات ہے کہ کسی دستور پر عمل کے تقاضے سے پہلے اس کی خوبی اور اس کی سچائی کے یقین کا مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ اگر اس دستور کی برتری اور اچھائی پر ہمیں مکمل یقین نہ ہو تو ایمان و دیانت کے ساتھ اس پر عمل کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے اور ایسے کمزور اور غیر یقینی عقیدہ و فکر کا کوئی اثر ہمارے قلب و ضمیر پر کبھی مرتب نہیں ہو سکتا ہے؟ ایمان کا اصل مقصد تو اس ارادہ و عمل یعنی قلب کی اصلاح ہے اس کی اصلاح یقین محکم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے علم و اعتقاد کی اس پختگی اور اس یقین محکم کی دعوت دی جا رہی ہے کہ جو فکر و عمل کی دنیا میں حقیقی انقلاب برپا کر سکیں۔ اہل ایمان کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں کہ انہیں معمولی سا شبہ بھی نہیں ہوتا۔

آپ تھوڑی دیر کیلئے سب سے پہلے عقیدہ توحید پر غور کر لیجئے کہ جو اسلام کا پہلا اور بنیادی عقیدہ ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے اس کا اظہار کرتا ہے اور وہ اس پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو لازمی طور پر اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی اور حاکمیت کے داغ دھبے سے اس کی پوری زندگی کا دامن پاک ہونا چاہیئے۔ اس کے سوا کسی اور کا قانون اس کیلئے قابل قبول نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کی زندگی کا سارا نظام اس کی نازل کردہ ہدایت پر مبنی ہونا چاہیئے اسے غیر اللہ میں ان تمام صفات کا پوری جرأت اور بے باقی سے انکار کر دینا چاہیئے۔ کہ جو معبود برحق کیلئے خاص ہے۔ اسی لئے قرآن پاک نے آخرت کے سلسلے میں مومنوں کی صفت اس طرح بیان کی: وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ (البقرۃ۔۴)

یعنی: ''اور آخرت پر وہ مکمل یقین رکھتے ہیں۔'' یعنی اللہ تعالیٰ کو آخرت کا معمولی اعتقاد اور سرسری تصور مطلوب نہیں بلکہ یقین کامل مطلوب ہے۔ ایسے یقین جیسے انسان اپنی آنکھوں سے روزِ جزا اور اس کے مناظر کو دیکھ رہا ہو۔ اس یقین کے بغیر اس میں نہ خدا ترسی پیدا ہوگی نہ تقویٰ ہوگا اور نہ اخلاق و اعمال میں درستگی آئے گی۔ اس لئے آخرت کے ذکر کے ساتھ ''یومنون'' کے بجائے ''یوقنون'' کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔

اب اگر ہم سے کوئی ایسی بات سرزد ہوتی ہے کہ جو یقین آخرت کے خلاف ہو تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارا یقین عملی طور پر شک اور تردد میں بدل گیا ہے یا پھر عملاً ہم اپنے آپ کو آخرت پر یقین رکھنے والا انسان ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے قول و عمل کا یہ تضاد، اہل ایمان کا شیوہ نہیں۔

آج ہمارے سامنے بے شمار مسائل ہیں ان کا حل کسی اور نظام میں تلاش کرنے کے بجائے ہمیں ایمان کامل اور یقین محکم کے ساتھ قرآن پاک میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اسی میں فلاح اور یہی ہمارا تشخص ملی ہے۔

اسلام کے تقاضے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آلِ عمران۔۱۱۰)

یعنی: ''(مسلمانو!) تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کیلئے وجود میں لائی گئی ہے۔''

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں سے اسلام کے تقاضے یہ ہیں کہ وہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم پر اس طرح عمل کریں کہ وہ اپنے قول و فعل میں انسانیت کیلئے نمونہ ثابت ہوں اور لوگوں کی رہبری اور ہدایت کا فرض ادا کریں۔

ہادیٔ برحق نورِ مجسم رسول اللہ ﷺ نے روئے زمین کے تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام سنایا اور خود اس پر حتماً و کاملاً عمل کر کے دکھایا ،اللہ کا یہ پیغام آخری پیغام ہے جو اس نے اپنے محبوب بندے حضرت محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا میں بھیجا اور یہ اعلان کر دیا کہ آپ کی ذاتِ قدسی صفات آخری رسول کی حیثیت سے اس دنیا میں آئی ہے اور اب کوئی اور پیغمبر نہیں آئے گا۔ اس طرح اللہ کا کلام قرآنِ حکیم کی شکل میں اب تک کیلئے بھیجا گیا ہے۔ اب نہ کوئی پیغمبر ہوگا اور نہ کوئی تازہ حکم اللہ کی جانب سے نازل ہوگا۔

یعنی مسلمانوں سے اسلام کے تقاضے دوگنا ہوئے خود اسلامی شریعت پر عمل کرنا اور دوسروں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنا اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے اور انہیں تمام طریق ہائے حیات پر غالب بنانے کیلئے طریقہ اور اصول یہ بتایا گیا۔ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ہر مسلمان کے بنیادی فرائض میں شامل کر دیا گیا۔ یعنی اسلام مسلمانوں سے صرف یہی نہیں چاہتا کہ سیلاب آئے تو اپنا دروازہ بند کر لیں اور دامن کو تر نہ ہونے دیں، بلکہ اسلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کفر و شرک کے سیلاب میں ڈوبنے والوں کو بچانا بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ گوشہ نشیں ہو کر راہبوں اور سادھوؤں کی طرح اپنے آپ کو دنیا سے الگ کر لینا اسلام کی تعلیم کے قطعاً منافی ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ دنیاوی آلودگیوں اور کفر و شرک کی آندھیوں سے دامنِ عصمت کی حفاظت کی جائے۔ اور کفر و شرک کا سدباب کر کے ابنائے جنس کو بچانے کی کوشش کی جائے۔ یہی اصل اور حقیقی ایمان ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے فرائض میں یہ باتیں شامل ہیں کہ وہ خود کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالیں اور عقائد اور عبادات کی پابندی کے ساتھ اپنے معاملات کو بھی درست رکھیں۔ دنیا میں خیر کی تبلیغ کریں اور شر کا سدباب کریں۔ آپ یقین کیجئے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیجئے کہ یہ بنیادی فرائض اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتے جب تک مسلمان اس حقیقت کو نہ سمجھ لیں کہ دنیا میں مجبوروں اور کمزوروں کی طرح زندہ رہنا مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے۔

آج کا مسلمان قرآن سے دور ہے اور اس لئے وہ علم و حکمت کے میدانوں سے پیچھے رہ گیا ہے اس کی اس غفلت کی وجہ سے سپر پاور عالم وجود میں آئی ہے۔ حالانکہ خود مسلمان کو اس کرہ ارض پر سپر پاور ہونا چاہیئے۔ قرآن حکیم نے مسلمان کا یہی مقام معین کیا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم تعلیمات قرآن پر عمل کریں۔ اور دنیا میں مقامِ غرو شرق حاصل کریں۔

(الف) قرآن کریم کی تعظیم وتکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ۝ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ۝ لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ ۝ (الواقعہ۔۷۷تا۷۹)

''کہ یہ بڑا باوقار قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب میں (پہلے سے) درج ہے، اُس کو وہی لوگ چھوتے ہیں جو خوب پاک ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں قرآن کریم کی تکریم کے دو احکام صادر فرمائے ہیں۔

(۱) کہ اس کتاب کے تقدس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے وہ چھوئے جو پاک ہو ناپاک انسان اسے ہرگز ہاتھ لگانے کی جرأت نہ کرے۔ (۲) اس کی رفعت شان کا تقاضا یہ ہے کہ اسے بلند مقامات پر رکھا جائے اس کی طرف پاؤں نہ پھیلائے جائیں۔ اسے پس پشت نہ رکھا جائے۔ اس کے اوپر کوئی چیز نہ رکھی جائے، اس کے اوراق کو پھینکا نہ جائے، اخبارات رسائل یا دیگر کتب کے ان صفحات کو جن پر اس کی آیات لکھی گئی ہوں عام استعمال میں نہ لایا جائے۔ اس مصحف پاک کو اہانت کے خدشے سے بچانے کیلئے آنحضرت ﷺ نے دشمن کی سرزمین میں اسے ساتھ لے جانے سے منع فرمایا ہے۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی وہ آخری اور مکمل کتاب ہے، جس کی فضیلت برکت، تقدس اور عظمت کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اس مبارک کتاب میں اس کے جو صفاتی نام آئے ہیں ان پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خداوند تعالیٰ کی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی ناقدری کا خیال بھی گناہ عظیم ہے۔ اس لئے پروردگارِ عالم نے جہاں اس کتاب کی فضیلت کا ذکر فرمایا ہے، وہیں اس کے ادب واحترام اور اس کے اکرام وتکریم کی بھی پوری پوری تاکید فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تقدیس وحرمت کا اگر شعور نہ ہو تو اس کی برکتوں سے محرومی یقینی ہے۔ ایسے آدمی کو ہدایت نصیب ہو سکتی ہے نہ خدا کا عرفان ہو سکتا ہے، نہ مقامِ رسالت کا ادراک ہو سکتا ہے، نہ زندگی کے اصول اور قوانین اس کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے ہمیں اس سرچشمۂ ہدایت سے سیر ہونے کے ساتھ اس کی تکریم کا حکم بھی دیا ہے۔ قرآنی احکام کے ساتھ ساتھ فرمانِ نبوی ﷺ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اسوۂ صحابہ بھی موجود ہے جن کی روشنی میں ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ اس کی تکریم تقاضائے ایمانی ہے اور جس نے اس کے اکرام واحترام میں کوتاہی کی، اس کے ایمان میں ضعف وخلل ہے۔ چونکہ یہ ایمان کا تقاضا ہے اور اس کا حکم خدا اور اس کے رسول نے دیا ہے، اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ اس کے اکرام واحترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کی تعظیم وتکریم کا تعلق ظاہر وباطن دونوں سے ہے، اس کے باطنی احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو منزل من اللہ سمجھا جائے، اس کے متعلق ہر شبہے اور وسوسے سے اپنے دل کو پاک رکھا جائے۔ مسند احمد کی ایک حدیث ہے کہ ''اس شخص کو اس کتاب عظیم سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا جس کے دل میں کسی طرح کا شک ہو۔'' اس لئے اس کا باطنی احترام تو یہی ہے کہ اسے حرف بہ حرف وحی الٰہی سمجھا جائے اور اس نسبت کو ملحوظ رکھا جائے جو اس کو رب ذوالجلال سے ہے۔ یعنی عظمت وکبریائی اور تقدس اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے تو اس کے کلام میں بھی یہی صفات ہیں اور حق یہ ہے کہ جس طرح ذاتِ باری تعالیٰ ساری عظمتوں اور حکمتوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کی نازل کی ہوئی یہ کتاب بھی اس نسبت سے اپنے اندر تنزہ، تقدس، حکمت اور عظمت رکھتی ہے۔

(ب) قرآن کریم کی تعظیم وتکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (الاعراف۔۲۰۴)

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اُس کو کان لگا کر سنو، اور خاموش رہو، تا کہ تم پر رحمت ہو،''

قرآن حکیم وہ دولت دارین ہے جس پر ہمیں فخر بھی کرنا چاہیئے اور ظاہری و باطنی تعظیم وتکریم کا حق بھی ادا کرنا چاہیئے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر امت کو ایک شرف عطا فرمایا ہے، اس امت کیلئے سب سے بڑا شرف اور اس کیلئے سب سے بڑا سرمایۂ افتخار قرآن شریف ہے۔''

اس کی تکریم کا ایک ظاہری پہلو یہ بھی ہے کہ اس کتاب مقدس کی آواز جہاں سے بھی آئے اور جب بھی کوئی اس کی آیات کو پڑھے تو سارے لوگ ساکت وصامت ہو جائیں، اور اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں۔ جہاں بھی اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی اس مبارک کتاب کی آیات پڑھی جارہی ہوں وہاں شور وشغب کرنا یا غیر سنجیدہ حرکات کا ارتکاب کرنا اس کتاب کی توہین اور رحمتِ خداوندی سے محرومی کا سبب ہے۔

قرآن شریف کی تعظیم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم اسے سمجھیں اور اس پر عمل بھی کریں۔ چنانچہ اس کا باطنی تقاضا یہ ہے کہ اسے صرف محرابوں، طاقوں اور الماریوں کی زینت بنا کر نہ رکھا جائے بلکہ نہایت صحت، خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے اور تدبر سے بھی کام لیا جائے۔ مضامین کے لحاظ سے قلب میں پیدا ہونے والی کیفیات اور تاثرات کا بھی اندازہ کیا جائے۔ اگر ذکرِ عذاب پر خوف طاری نہ ہو، اگر جنت کی بشارت پر بشاشت پیدا نہ ہو، اگر جہاد کے حکم سے حرارت ایمانی نہ پیدا ہو، اگر عظمت وکبریائی کے ذکر سے دل مائل بہ سجود نہ ہو تو اس کی تکریم کا حق ادا نہیں ہوا۔

کتاب اللہ کی تعظیم کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جس نظامِ حق کے برپا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کی جدوجہد میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا جائے اس کی تعظیم صرف تلاوت تک محدود نہ رکھی جائے بلکہ اس کے احکام کو انفرادی اور معاشرتی نیز قومی و ملی زندگی پر منطبق کیا جائے۔ اور ہر موڑ پر اس سے روشنی حاصل کی جائے۔ قرآن کی تعظیم کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ انسانی ہدایت کیلئے اس کو سب سے بڑے ماخذ کی حیثیت سے تسلیم کرنے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دی جائے۔ جب اس کا فیصلۂ ناطق سامنے آجائے تو ساری زبانوں کو گنگ ہو جانا چاہیئے اور تسلیم ورضا کی پوری شان کے ساتھ سر جھکا دینا چاہیئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہی وہ کتاب ہے جس سے بعض لوگوں کو خداوند تعالیٰ بلند کرتا ہے اور بعض لوگوں کو ذلیل وخوار کرتا ہے۔ اس ارشاد کا مطلب بہت واضح ہے کہ جو لوگ اس کی تعظیم وتکریم اور اس پر عمل کے تقاضوں سے روگردانی کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ جل شانہٗ انہیں رسوا کر دیتا ہے اور جو اس کی تعظیم وتکریم کا پورا حق ادا کرتے ہیں، خدا ان کو بلندی عطا فرماتا ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو بھی کتاب اللہ کی تعظیم وتکریم کرنے والوں میں شامل فرمادیں۔ (آمین)

تلاوت قرآن کریم کے فضائل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط (عنکبوت۔۴۵)

"(اے پیغمبر!) جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی گئی ہے، اُس کی تلاوت کرو، اور نماز قائم کرو۔"

حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمائش کر کے کلام اللہ سنتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جس کی تلاوت بھی فضیلت رکھتی ہے اور جس کا دیکھنا اور چھونا بھی اجر و ثواب رکھتا ہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ انہوں نے خواب میں پروردگارِ عالم سے پوچھا کہ خداوندا! تیری کون سی عبادت تجھ سے سب سے زیادہ قریب کرتی ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ تلاوت قرآن ہی وہ عبادت ہے جس کے ذریعہ سے ایک بندے کو میرا سب سے زیادہ تقرب حاصل ہوتا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ کوئی بغیر سمجھے پڑھے تو، ارشاد ہوا اس کو بھی ثواب ملے گا اور اسے بھی تقرب حاصل ہوگا۔ یہ اگرچہ خواب ہے اور اسے سند اور حجت نہیں قرار دیا جا سکتا مگر حدیث نبوی کے مفہوم سے یہ بات مکمل مطابقت رکھتی ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں، تعلیم و تعلم، تلاوت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے، بلکہ اس عمل کا ایک پہلو ہے۔ اس لئے تلاوت خیر العمل ہے اور اس کے کرنے والے اخیار امت ہیں۔

ہمارے ہاں اہل اللہ کی اصطلاح عام ہے، ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اہل اللہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو تلاوت قرآن کرتے ہیں۔"

مشکوٰۃ کی حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن تین شخص مشک آنود کے ٹیلوں پر ہوں گے، ان میں ایک وہ شخص بھی ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے تلاوت قرآن کرتا ہے۔

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کے ہر حرف پر دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ "الٓمّٓ" ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ یہ بھی حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ مومن کو چاہیئے کہ اپنے نفس کو قرآن کی تلاوت کی طرف مائل کرے۔ کیونکہ تلاوت کلام پاک ہی اللہ اور اس کے رسول سے محبت کا ثبوت ہے۔ محبوب کی خوبو، عادت اور گفتگو، محبت کرنے والے کیلئے دل پذیر ہوتی ہے۔ قرآن پاک کلامِ الٰہی ہے، اس لئے مومن کے دل میں اس کی گہری محبت ہونی چاہیئے۔ گفتار محبوب کو بار بار دہرانے والے، محبوب کے التفات اور اس کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ اسی ضابطے کے تحت تلاوت کرنے والے کی طرف رحمت خداوندی متوجہ ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کی ہر آیت جنت کا ایک درجہ اور گھر کا چراغ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے، وہاں برکت ہوتی ہے۔ اور جہاں نہیں پڑھا جاتا وہاں تنگی پیدا ہوتی ہے۔ بے شک قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کا سمجھنا، اس کی تلاوت کرنا، اس کے احکامات پر عمل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے اور یہ قرآن ہی ہے کہ جو اس کرۂ ارض کے رہنے والوں کی صحیح راہنمائی کر سکتا ہے۔

قرآن کی بے ادبی کی صورتیں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ۝ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ۝ لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ ۝ (الواقعہ۔۷۷تا۷۹)

''کہ یہ بڑا باوقار قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب میں (پہلے سے) درج ہے، اُس کو وہی لوگ چھوتے ہیں جو خوب پاک ہیں،''

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وہ آخری اور مکمل کتاب ہے، جس کی فضیلت، برکت تقدس اور عظمت کا ذکر خود اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مختلف جگہ کیا ہے۔ اس مبارک کتاب میں اس کے جو صفاتی نام آئے ہیں ان پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خداوند تعالیٰ کی وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کی ناقدری کا خیال بھی گناہ عظیم ہے۔ اس لئے پروردگار عالم نے جہاں اس کتاب کی فضیلت کا ذکر فرمایا ہے وہیں اس کے ادب واحترام اور اس کے اکرام وتکریم کی بھی پوری پوری تاکید فرمائی ہے۔ اس کی تقدیس، حرمت کا اگر شعور نہ ہو تو اس کی برکتوں سے محرومی یقینی ہے۔ اس کی بے ادبی کی چند مختلف صورتیں درج ذیل ہیں:

☆ بغیر وضو کے قرآن مجید کو چھونا ☆ کتب تفسیر یا عام کتابوں میں لکھی ہوئی قرآنی آیات پر بغیر وضو ہاتھ لگانا ☆ نجس جگہ پر بیٹھے ہوئے زبانی یا ناظرہ قرآن مجید پڑھنا، ☆ جب تلاوت کی آواز کانوں میں پڑ رہی ہو تو اس کو خاموشی سے نہ سننا ☆ قرآن مجید یاد کر کے بھلا دینا ☆ قرآن مجید کے اوپر کوئی کتاب رکھنا خواہ حدیث فقہ ہی کی کیوں نہ ہو ☆ قرآن مجید کے اوپر اپنی عینک، قلم یا ٹوپی رکھنا ☆ قرآن مجید کی طرف پاؤں پھیلانا ☆ قرآن مجید نیچے ہونا اور خود قریب ہی اونچی جگہ پر بیٹھنا ☆ قرآن مجید ایسی جگہ رکھنا جہاں آنے جانے والوں کی پشت ہوتی ہو ☆ تلاوت کے دوران پاؤں کو ہاتھ لگانا یا ناک میں انگلی ڈالنا ☆ بغیر شرعی عذر کے لیٹ کے قرآن مجید پڑھنا ☆ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے وقت حقہ یا سگریٹ پینا یا منہ میں نسوار رکھے ہوئے تلاوت کرنا ☆ ناجائز کاروبار میں برکت کیلئے قرآن پڑھنا یا پڑھوانا ☆ قرآنی حروف والی انگوٹھی یا لاکٹ پہن کر بیت الخلاء جانا (مکروہ ہے) ☆ اخبارات میں قرآنی آیات کی اشاعت کرنا پھر انہیں عام کاغذوں کی طرح زمین پر پھینک دینا ☆ اخبار رسائل وغیرہ جن میں آیاتِ قرآنی وغیرہ ہوں ان کو دسترخوان کیلئے استعمال کرنا ☆ قرآن مجید کے نقوش کی طرف پاؤں کرنا ☆ مونوگرام یا گفٹ والی اشیاء پر آیات لکھنا جس سے بے ادبی ہونے کا خدشہ ہو ☆ قرآن مجید کی آیات مصوری اور خطاطی کے مختلف ڈیزائنوں میں اس طرح لکھنا کہ پڑھنے والے سمجھ نہ سکیں اور غلط پڑھیں۔ یہ سخت بے ادبی ہے ☆ قرآن مجید کو میت کے ساتھ قبر میں رکھنا ☆ قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کو عام کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں پھینکنا (مقدس اوراق کو دریا میں یا کسی غیر آباد کنویں میں ڈال دیا جائے یا زمین میں دفن کر دیا جائے) ☆ قرآنی آیات والا کاغذ کھلی حالت میں بیت الخلاء لے جانا۔ اگر چمڑے اور چاندی وغیرہ میں بند ہو تو یہ اس سے مستثنیٰ (خارج) ہے ☆ آیات قرآنی کو حقیر سمجھتے ہوئے آگ میں ڈالنا ☆ لہو ولعب (کھیل کود) کی محافل کی ابتدا تلاوت قرآن سے کرنا ☆ جس نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور گمان کیا کوئی شخص اس سے اس کی عزت کرے گا ☆ قرآن مجید پر کاپی رکھ کر لکھنا ☆ قرآن مجید رکھ چھوڑنا، مدتوں اس کی تلاوت نہ کرنا کہ اس پر غبار پڑتا جائے ☆ حروف ٹھیک ادا نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ قرآن حکیم کی توہین و بے ادبی رحمت خداوندی سے محرومی کا سبب ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہم سب کو بے ادبی سے بچائیں۔ (آمین)

حکومتِ قرآن

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ (یوسف۔۴۰) ”حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔“

برصغیر کے مسلمان تحریک آزادی میں شریک ہوئے اور جدوجہد آزادی میں اس نظریہ اساس کے ساتھ مستعد و متحرک ہوئے کہ وہ پاکستان قائم کریں گے، جہاں قرآن کی حکومت ہوگی اور اللہ کا قانون نافذ ہوگا۔ ان کے پاس جذبۂ صادق تھا۔ ان کا ایمان کامل تھا، اور ان کا یقین محکم کہ دنیا کی ہر بڑی طاقت مسلمانانِ برِصغیر کے جوشِ ایمانی کے سامنے زیر ہوگئی اور غیر ملکی استعمار نے ہار مان لی۔

یہ عجیب و حیرت انگیز حقیقت ہے اور کرشمۂ الٰہی کہ پاکستان ٹھیک اس دن عالم وجود میں آیا اور منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا، کہ ۲۷ رمضان المبارک تھی، یوم نزول قرآن تھا! بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا، یہ نظامِ الٰہی تھا کہ پاکستان ایسے دن قائم ہوا کہ جو تمام عالم اسلام کے نزدیک مبارک اور متبرک ہے اور جس کی عظمت و تقدیس میں پورا عالم اسلام متفق ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا یہ بڑا اہم فیصلہ تھا، کیونکہ منشاءِ الٰہی یہی تھا کہ پاکستان قائم ہو اور اس میں حکومت قرآن قائم ہو۔

۲۷ رمضان المبارک نزول قرآن ہے۔ اس یوم مبارک کے بارے میں قول فیصل ہے اور حرفِ آخر کہ اسلام اور عالم اسلام کیلئے یہ تاریخ ساز دن ہے۔ اس دن قرآن کریم نازل ہوا، اس لئے نازل ہوا کہ اس کرۂ ارض کی ہر تاریکی کو روشنی سے منور کردے، اور ہر باطل کو مٹا کر حق کو قائم کردے اور اس کرۂ ارض پر اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو۔

سورۂ مائدہ میں ارشاد ربانی ہے: وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (المائدہ۔۴۹)

یعنی ”اور (ہم حکم دیتے ہیں) کہ تم ان لوگوں کے درمیان اسی حکم کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے۔“

اس ارشاد ربانی کی روشنی میں ہمیں یہ غور کرنا چاہیئے کہ وہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ کتاب پر ایمان لائے، لیکن عملاً ان کا یہ حال ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ: اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ (النساء۔۶۰)

”(لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کیلئے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں؟“

ایسے لوگ صحیح راہ پر نہیں ہیں۔ وہ ایک سانس میں اللہ کے قانون کی بات کرتے ہیں، مگر دوسرے سانس میں اس کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا قلب ایمان متزلزل ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ: وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ (الانعام۔۱۱۵)

”اور تمہارے رب کا کلام سچائی اور انصاف میں کامل ہے۔ اُس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔“

۲۷ رمضان المبارک کو پاکستان قائم ہوا تھا، عالم وجود میں آیا تھا، اس کی حیثیت تاریکی میں نور کی ہے۔ ہم نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم پاکستان کو اسلامی مملکت بنائیں گے۔ ہم کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے، کیا ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے؟ اگر نہیں تو جاگئے اور بیدار ہو جایئے اور فیصلہ کیجئے کہ پاکستان میں اقتدار اعلیٰ قرآن مجید کو حاصل ہوگا۔ اسلام و قوانین کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

اسلام میں حیاتِ دنیوی کا تصور

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (البقرہ۔۱۶۸)

یعنی ”اے لوگو! زمین میں جو حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو کہ وہ تمہارے لئے ایک کھلا دشمن ہے۔“

قرآن حکیم اس طرح واضح طور پر ہماری رہنمائی کرتا ہے، ہم زمین سے وہ سب کچھ حاصل کریں اور اس سے فائدے حاصل کریں جس کی ہمیں خدا اور رسول ﷺ نے اجازت دی ہے اور ان تمام باتوں سے بچیں جن کی ہمیں ممانعت کر دی گئی ہے۔ کیونکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم اگر حدود اللہ سے تجاوز کریں تو شیطانی راہ پر چلیں گے، جو بدی کی راہ ہے۔ اور اس کے بعد اہلِ ایمان اور غیر اہلِ ایمان کا امتیاز ختم ہو جائے گا اور ہم تشخص سے محروم ہو جائیں گے، جو ایک ملت کی حیثیت سے ہمیں حاصل ہے۔ اور ہمارے اور دوسروں کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

دنیا کا ہر نظام انسان کی دنیوی زندگی کے متعلق اپنا ایک مخصوص تصور اور مخصوص معیار رکھتا ہے۔ درحقیقت اس تصور سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلو متعین ہوتے ہیں۔ ہر نظام اپنا ایک مخصوص نظریہ حیات رکھتا ہے اور نظریہ کے مطابق وہ اپنے ماننے والوں کے افعال و کردار کو جانچتا پرکھتا ہے۔ اسلام بھی ہمیں ایک نظریہ حیات عطا کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر ہماری دنیوی اور دینی زندگی کو وہ معیار بخشتا ہے جن پر ہماری کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔

اسلام میں دوسرے مذاہب کے برعکس دین اور دنیا کی علیحدگی کا تصور نہیں ہے۔ نہ اسلام میں ترک دنیا اور رہبانیت کا تصور ہے اور اسلام اس کا بھی قائل نہیں ہے کہ دنیوی زندگی میں، معاملات میں، تجارت میں، سیاست میں، تعلیم میں اپنی صنعت میں جو چاہے کرے جس طرح چاہے اپنے معاملات طے کرے۔ نہ اسلام اس کو مانتا ہے کہ انسان کو پوری آزادی ہے کہ وہ ان شعبوں میں بلا روک ٹوک جو رویہ چاہے اختیار کرے۔ یہ ایک محدود اور ناقص تصور ہے اور قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔

اسلام ہمیں اس آزمائش گاہ میں اس طرح زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے کہ ہر وقت یہ احساس رہے کہ ہمارے ہر عمل کا نتیجہ دوسری زندگی میں ظاہر ہوگا۔ اچھے اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا سے ہم نہیں بچ سکیں گے۔ اس لئے دنیوی زندگی گذارتے وقت اللہ کے حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق نہیں بھولنے چاہئیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بنیاد پر جس حیاتِ دنیوی کا تصور قائم ہو وہ ایسے پاکیزہ معاشرے کا ذریعہ بنے جس میں کمال درجہ اعتدال ہو، امن و چین ہو، دیانت امانت ہو، اہل علم کی قدر دانی ہو، اخلاق و کردار کی اعلیٰ مثالیں ہوں، اعتماد و اطمینان کا دور دورہ ہو۔ ایک حدیث شریف میں سرکارِ دو عالم ﷺ نے نہایت جامع اور بلیغ انداز میں حیات دنیوی کا مکمل تصور پیش کر دیا ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ: ”دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔“

رسالت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (البقرہ۔۲۱۳)

”(شروع میں) سارے انسان ایک ہی دین کے پیرو تھے پھر (جب ان میں اختلاف ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے جو (حق والوں کو) خوشخبری سناتے اور (باطل والوں کو) ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی تا کہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں ان کا اختلاف تھا۔“

ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے، پھر آگے چل کر جب یہ حالت نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے انجام سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق بھیجی تا کہ لوگوں میں جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں ان کا فیصلہ کریں ان اختلافات کی وجہ (یہ نہ تھی کہ لوگوں کو حق معلوم نہیں تھا بلکہ) یہ تھی کہ لوگ حق سے واقفیت اور آگاہی کے باوجود آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

اس آیت کریمہ کا مضمون کسی تشریح اور توضیح کا نہ متلاشی ہے نہ محتاج، اگر ہم اس آیت مبارکہ کے مفہوم کو اپنے اوپر منطبق کریں تو یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ ہمارا حال اس وقت بعینہٖ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اس فرمان کے مطابق ان افراد اور اقوام کا تھا، جنہوں نے ہم سے پہلے ذاتی مقاصد اور مفادات کی تکمیل کیلئے ربانی ہدایات سے واقف ہونے اور ان پر ایمان رکھنے کے باوجود انہیں پسِ پشت ڈال دیا تھا اور آپس میں اختلافات پیدا کر لئے تھے۔

سابقہ امتوں کیلئے تو یہ موقعہ تھا کہ جب وہ اس طرح حق کو بھلا دیتی تھیں تو ان کی اصلاح کیلئے اور انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کیلئے دوسرے نبی آتے تھے۔ لیکن خاتم النبیین ﷺ کی امت کیلئے یہ راستہ تا قیامت بند ہے، اسی لئے امت کی ذمہ داری زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اپنے نبی کی تعلیمات کو یاد رکھنا ہم پر فرض ہو جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے جس خرابی کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے وہ ہے ذاتی اور گروہی مقاصد کی بنا پر اختلاف، ان تمام خرابیوں اور بیماریوں کی جڑ جن میں ہم مبتلا ہیں، یہی اختلاف باہمی ہے۔ غور کیجئے کہ جو امت تمام انسانوں کے اختلاف مٹانے پر مامور کی گئی تھی آج خود اختلاف وانتشار کا شکار ہے اور اس اختلاف کا اثر ہے کہ آج ہم اپنے ذاتی وگروہی مفادات کو امت کے مفادات پر ترجیح دینے لگے ہیں اور ساری دنیا میں حق سے اس بغاوت کے نتائج بھگت رہے ہیں۔ ہمارا عقیدۂ رسالت ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات آپ ﷺ کی ان ہدایات پر، جن پر ہم ایمان کے مدعی ہیں، دل وجان سے عمل کرنے پر کمربستہ ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے امت کو جو آخری وصیت فرمائی تھی، اس میں ارشاد فرمایا تھا کہ: ”میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ اگر تم ان پر سختی سے پابند رہے تو تم کبھی گمراہ نہ ہو گے، اور یہ دو چیزیں ہیں اللہ کی کتاب اور میرا طریقہ، یعنی میری سنت۔

ہم رسول اللہ ﷺ سے محبت کے دعویدار ہیں اور آپ ﷺ کا یہ فرمان ہمیں وہ راہ دکھاتا ہے جس کی پیروی کر کے آج ہم گمراہی سے بچ سکتے ہیں اور دین کی ان ہی دونوں سنتوں کو اپنا معیار قرار دے کے اپنے اختلافات ختم کر سکتے ہیں۔

(الف) فرائضِ رسالت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ ؕ (الانعام۔۱۲۴) یعنی ”(حالانکہ) اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کس کو سپرد کرے۔“

خداوند تعالیٰ کا پیام بندوں تک پہنچانے کو رسالت کہتے ہیں، یہ رسالت کسبی نہیں وہبی چیز ہے، خدا ہی جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اس لئے کہ رسالت کوئی معمولی مرتبہ نہیں بلکہ نہایت مہتم بالشان مقام ہے اور یہ قانون فطرت ہے کہ جس کا مقام و مرتبہ جتنا بلند ہوگا اس کی ذمہ داریاں بھی اتنی ہی وسیع ہونگی۔ دنیا جانتی ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کو تمام انبیائے کرام پر فضیلت ہے، آپ ﷺ کی رسالت ابدی اور عالمگیر ہے۔ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب وہ آخری کتاب ہے جس کے بعد کوئی کتاب نہیں نازل ہوگی۔ آپ ﷺ کا لایا ہوا دین ایسا جامع، ایسا مکمل اور اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس کے بعد کسی دین، شریعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ نبوت و رسالت، دین و شریعت، کتاب و وحی سب کی تکمیل فرما کر ہمیشہ کیلئے ان کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ آپ ﷺ سارے عالم کیلئے نبی ہیں، افضل المرسلین اور خاتم الانبیاء ہیں، آپ ﷺ کا یہ عظیم الشان منصب خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ آپ کے فرائض کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع ہوگا اور یقیناً یہ آپ ہی کا مرتبہ و کمال ہے کہ آپ ﷺ نے اتنے اہم اور ایسے عالمگیر فرائض ایسی تکمیل اور اس حسنِ اسلوب کے ساتھ انجام دیئے کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دنیا کے سارے مفکروں اور فلسفیوں پر سکتہ طاری ہے، زمین و آسمان محوِ تحیر ہیں۔

اس خاصۂ خاصاں رسل کے فرائض پر خود قرآن کریم نے روشنی ڈالی ہے۔ پہلے مقام کی مظہر تو خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھانے کے وقت وہ دعا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ ؕ (البقرہ۔۱۲۹)

ترجمہ: اور ہمارے پروردگار! اِن میں ایک ایسا رسول بھی بھیجنا جو انہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاکیزہ بنائے۔

دوسری آیت ہے: کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَکِّیْکُمْ وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ۔۱۵۱)

ترجمہ: (یہ انعام ایسا ہی ہے) جیسے ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

تیسری آیت ہے: لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۚ (آل عمران۔۱۶۴)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ اُن کے درمیان اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں پاک صاف بنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔

چوتھی آیت سورہ جمعہ کی ہے اور اس میں بھی انہی اوصاف کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ان آیات پر غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو صرف آیاتِ قرآنی سنا دینے کیلئے نہیں بھیجا تھا بلکہ آپ کی بعثت کے تین مقاصد اور بھی تھے۔ ایک کہ آپ لوگوں کو تعلیم دیں، دوسرے اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں، تیسرے یہ کہ آپ افراد اور ان کی ہیئت کا اجتماعی تزکیہ کریں۔ اجتماعی مفاسد کو مٹا کر صلاح و فلاح کی فضا پیدا کریں۔ اگر کتاب و حکمت کی تعلیم صرف آیات سنا دینے تک محدود ہوتی تو تزکیہ کا علیحدہ ذکر بے معنی ہوتا۔

(ب) فرائضِ رسالت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ۝ (النحل۔۴۴)

یعنی: اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لئے نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے اُن باتوں کی واضح تشریح کر دو جو اُن کیلئے اُتاری گئی ہیں، اور تا کہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔

اس آیت کریمہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے فرائض میں یہ بھی تھا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ جو احکام و ہدایات دے ان کی آپ ﷺ پوری پوری تشریح کر دیں۔ تشریح کا عمل صرف متن اور اس کے الفاظ تک محدود نہیں رہتا۔ الفاظ کی دلالت، ان کی معنویت کی وضاحت، اور ان کے اطلاقات کے موقع و محل کی صراحت بھی اس ذیل و ضمن میں آتی ہے۔ ورنہ پھر تشریح کہاں ہوئی، قرآن نے آپ ﷺ کو مترجم نہیں بلکہ شارح کہا ہے اور تبیین و توضیح کو آپ ﷺ کا حصہ قرار دیا ہے۔ توضیح کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ سننے والا اچھی طرح سے مطلوب کو سمجھ لے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اگر مسئلہ اپنے اندر عملی پہلو رکھتا ہو تو آپ عملی نمونہ و مثال بن کر توضیح فرمائیں۔ یہی علمی مظاہرہ انسانوں کیلئے آیاتِ ربانی کے منشا سے صحیح طور پر واقف ہونے کی عزت بخشے گا۔ کیونکہ کتاب کا مطلب اور مدعا پوچھنے والوں کیلئے یہ انداز کبھی مفید نہیں ثابت ہو سکتا کہ صرف اس کے الفاظ دہرا دیئے جائیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو تشریح کتاب کا منصب بھی عطا فرمایا۔ یہ آپ کا فرض بھی تھا اور آپ ﷺ کا منصب بھی اور جو شخص اس منصب کو رسالت سے جدا ایک شخصی اور ذاتی چیز تصور کرتا ہے اس کا ذہن رسالت کے حقیقی تصور سے محروم ہے۔

رسالت کے فرائض کا ایک اہم جزو تبلیغ بھی ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں کیا گیا:

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ط (المائدہ۔ ۶۷)

یعنی: ”اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو (اس کا مطلب یہ ہوگا کہ) تم نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا۔“ (المائدہ۔۶۷)

اس آیت مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایتوں کو بے کم و کاست بندوں تک پہنچا دینا رسول کے فرائض میں تھا۔ اسی رسالت اور پیغمبری کا حق ادا کرنے کیلئے آپ کو گھر بار بھی چھوڑنا پڑا، لیکن یہ سب کچھ پیغمبرانہ شانِ تسلیم و رضا کے ساتھ آپ ﷺ نے گوارا کیا۔ یہاں تک کہ نزول کتاب کا سلسلہ مکمل ہو گیا اور اقصائے عالم میں خدا کا آخری پیغام پہنچ گیا۔ آپ مظلومی سے نصرت و فتح کی منزل تک پہنچے اور آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اتنے بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے تین بار دریافت فرمایا:

اَ لَا ھَلْ بَلَّغْتُ ؟ لوگو! کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچایا؟ لوگوں نے کہا بے شک آپ نے پہنچا دیا۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ خداوندا! تو گواہ رہ!۔ یہ تھے رسالت کے فرائض جو بے مثال حسن اور کمال عظمت کے ساتھ آپ نے انجام دیئے۔ آپ ﷺ کی روح پاک پر صلوٰۃ فراواں نازل ہو۔

نبی رحمت ﷺ قرآن کی نظر میں

اَعُوْذُ بِا للّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ۝

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (الحجرات۔۲)

"اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند مت کیا کرو، اور نہ اُن سے بات کرتے ہوئے اس طرح زور سے بولا کرو جیسے تم ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں، اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔"

اس آیت کریمہ میں نبی رحمت ﷺ سے ادب و تعظیم کے ساتھ پیش آنے کی تاکید و ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اس ہدایت سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک نے نبی کو کس مقام عظمت و رفعت پر فائز کیا ہے، اس کی تکریم اور عقیدت کو کتنی اہمیت دی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ رسول کی اطاعت مثل اطاعت الٰہی ہے۔ رسول کی محبت، حب الٰہی کے برابر ہے اور مسلمانوں کے ایمان کا جز ہے۔ اس کے ساتھ قرآن یہ بھی بتاتا ہے اور پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ بتاتا ہے کہ نبی بھی ایک انسان ہے اور اسی طرح کا انسان ہے جس طرح دوسرے انسان ہیں۔ اسلام سے پہلے یہ تصور راسخ تھا کہ انسان کبھی اللہ کا خلیفہ اور نائب نہیں ہوسکتا۔ مصلحین، ہادیین، اور انبیاء کو ایک مافوق الفطرت ہستی سمجھا جاتا تھا۔ عام اندازِ فکر یہ تھا کہ ایک آدمی جو عام آدمیوں کی طرح کا ہو، انہی کی طرح چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، سوتا جاگتا ہو، نبی کیسے ہوسکتا ہے؟ اسی بناء پر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کی بات ماننے سے بھی فرعون نے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔ سورۂ مومنون میں ہے: "انومن لبشرین مثلنا" لیکن قرآن نے ان تصورات کو غلط قرار دیا اور حضور اکرم ﷺ سے خود ایک سے زیادہ بار یہ کہلوایا کہ میں بھی تمہاری ہی طرح انسان ہوں: "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" (الکہف)

حضور ﷺ کو اس اعلان کا حکم دے کر قرآن نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی ایک انسان ہیں، ایک بشر ہیں، شادی بیاہ کرتے ہیں، ملتے جلتے ہیں، ایک انسان پر جس طرح رنج و غم اور مسرت و راحت وارد ہوتی ہے اسی طرح نبی اکرم ﷺ پر بھی ان کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام دین فطرت ہے، انسانوں کیلئے ہے، انسانوں کی فلاح کیلئے، دنیا میں عمل کرنے کیلئے، دنیا سدھارنے کیلئے ہے۔ یہ دین نبی کے ذریعے نازل ہوا ہے اور اس لئے نبی کا انسان ہونا لازمی ہے۔

قاضی ابوبکر ابن عربی نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور ادب آپ کی وفات کے بعد بھی ایسا ہی واجب ہے جیسا حیات میں تھا۔ اس لئے علمائے امت نے فرمایا کہ آپ کی قبر شریف کے سامنے بھی زیادہ بلند آواز سے سلام و کلام کرنا ادب کے خلاف ہے۔ اسی طرح جس مجلس میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث پڑھی یا بیان کی جارہی ہوں اس میں بھی شور و شغب کرنا بے ادبی ہے، کیونکہ آپ کا کلام جس وقت آپ کی زبان مبارک سے ادا ہو رہا ہو اس وقت سب کیلئے خاموش ہو کر اس کا سننا واجب و ضروری تھا۔ اسی طرح بعد وفات جس مجلس میں آپ کا کلام سنایا جاتا ہو وہاں شور و شغب کرنا بے ادبی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کا جتنا مطالعہ کرو گے شارح قرآن کا اسوۂ حسنہ روشن ہوتا جائے گا اور قرآن کے آئینے میں سیرت نبی کی منور تصویر نمایاں ہوگی۔ خدا کی رحمت ہو نبی اعظم و آخر پر جس نے ہمیں کتاب مبین سے نوازا اور حق و صداقت، عظمت و پروازی، اور فلاح و سعادت کا راستہ دکھایا۔ آپ ﷺ کی روح پاک پر صلوٰۃ فراواں نازل ہو۔

اطاعتِ رسول ﷺ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ (سورۃ النساء۔۶۴)

یعنی: ''اور ہم نے کوئی رسول اس کے سوا کسی اور مقصد کیلئے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

اگر کوئی شخص رسول کی اطاعت کے بغیر راہِ راست اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے اپنا تعلق قائم کرنا چاہے تو اسلامی نقطۂ نظر سے وہ راہِ راست پر نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت خاتم النبیین ﷺ کے بعد ہدایت صرف آپ ﷺ کی پیروی اور اطاعت کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا وسیلہ تلاش کرے، یا دوسرے دین کی پیروی کرے تو وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی نگاہ میں مقبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں بار بار اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو۔ یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی اطاعت قابل قبول ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر اس کے محبوب بندے اور نبی احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی اطاعت نہ کی جائے۔

یہ بات ویسے بھی عقل کے مطابق ہے کہ اسلامی شریعت انسانوں تک رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے ہی پہنچی ہے۔ اور قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یہ بات بھی آنحضرت ﷺ نے ہمیں بتائی ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ تشریف نہ لاتے تو ہمیں نہ اللہ کی واحدانیت کا علم ہوتا نہ اس کے احکام کی خبر ہوئی۔ اس کے علاوہ اللہ کے رسول کی حیثیت محض پیغام رساں کی نہ تھی بلکہ حضرت محمد ﷺ انسانوں کے ہادی اور رہبر تھے۔ اور آپ کے ہر قول اور ہر فعل کا اتباع درحقیقت اللہ کے حکم کا اتباع ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے فرمایا ہے کہ:

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ ۚ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۚ (الحشر۔۷)

یعنی: ''اور رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں، اُس سے رُک جاؤ۔''

سورہ نجم میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا: وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (النجم۔۳۔۴)

یعنی: ''اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی ہوئی ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ قولِ رسول ﷺ درحقیقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے۔ آنحضرت ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہی انسانوں کیلئے تقلید کا نمونہ ہے، جو شخص اپنے اعمال کو رسول ﷺ کے قول وفعل سے جتنا زیادہ ہم آہنگ کرے گا وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی نگاہ میں اتنا ہی زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہوگا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

دین نام ہے ''خلوص اور وفاداری'' کا صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کس کے ساتھ خلوص اور وفاداری۔ ارشاد فرمایا: اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ، اللہ کے رسول (ﷺ) کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں، پیشواؤں کے ساتھ اور ان کے عوام کے ساتھ۔ (مسلم) اللہ ہم سب کو اطاعت رسول کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

نبیٔ رحمت ﷺ بحیثیت سربراہِ ملت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ (الاحزاب ۲۱)

ترجمہ: ”حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اُس شخص کیلئے جو اللہ سے اور یومِ آخرت سے اُمید رکھتا ہو۔“

سرکارِ دوعالم، فخرِ موجودات، سرورِ کونین، ختم الرسل حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ اور حیات پاک ہر مسلمان کے اسوہ حسنہ اور نمونہ عمل ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کیلئے ہمیں ہر قدم پر ہر شعبہ زندگی میں سرکار کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ حضور ﷺ دنیا میں آخری پیغمبر کی حیثیت سے تمام علمی و عملی کمالات کے جامع اور انسان کامل کا ایک نمونہ بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے امت کو عقائد و عبادت ہی کی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ زندگی کے ہر میدان میں وہ حکمت آفرین ہدایات دی ہیں کہ ان پر عمل کر کے دین و دنیا کی نعمتیں حاصل کی جاسکتی ہیں اور اس کے بعد ہمیں رہنمائی کیلئے کسی جانب دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اگر دنیا اسی حکیمانہ نمونہ فکر و عقل کو اپنالے تو جس اضطراب اور انتشار میں وہ آج پھنسی ہوئی ہے، اس میں مبتلا نہ ہو۔

ہمیں یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ آپ جس طرح ایک مشفق باپ اور ایک محبت کرنے والے شوہر ہیں، اسی طرح امت کے حاکم اور سربراہ ہیں۔ ایک سربراہ کے دلنواز سخن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے محبت سے کام لے ان کو کم تر نہ سمجھے، اور ان کی عزت بڑھائے۔ کیونکہ انسانی عظمت کردار میں پوشیدہ ہے۔ اخلاق میں مضمر ہے، علم پر منحصر ہے، خدمت میں خفیہ ہے۔ عہدہ اور دولت عزو شرف کا معیار نہیں ہے۔

حضور ﷺ اپنے معمولی سے معمولی ماتحتوں کے ساتھ برابر سے کام کرتے۔ ایک بار حضور ﷺ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سفر پر تشریف لے گئے اور سفر کے دوران میں ساتھیوں کو بکری بھوننے کا حکم دیا۔ ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں اسے ذبح کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں اس کا گوشت تیار کروں گا، تیسرے صاحب نے اس کو پکانے کیلئے اپنی خدمات پیش کیں۔

سربراہ امت ﷺ نے ارشاد فرمایا اور جنگل سے لکڑیاں میں لاؤں گا۔ اصحاب رسول نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم جو حاضر ہیں آپ نے فرمایا، ٹھیک ہے مگر مجھے یہ پسند نہیں کہ میں امتیاز کے ساتھ الگ بیٹھا رہوں۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں فرماتا ہے کہ کوئی شخص اپنے رفیقوں میں ممتاز بننے کی کوشش کرے۔

سردارِ ملت کی ایک ضروری خصوصیت ان کی دلسوزی ہمدردی بھی ہے۔ حضور ﷺ اس خلوص میں بھی بے مثال تھے لوگوں کے دکھ درد کا بے حد خیال رکھتے تھے۔

غرض مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ تدبر، مشاورت، عدل، دلنوازی، دلسوزی، سادگی، خدمت، ہمدردی اور ہر دلعزیزی کے وہ اصول اور پیمانے حضور ﷺ نے اپنے اسوہ حسنہ سے ہمیں عطا کئے ہیں۔ وہ سربراہان ملت حکومت کیلئے رہتی دنیا تک سرچشمہ ہدایت رہیں گے۔

نبیٔ رحمت ﷺ کے اخلاق اعلیٰ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝ (القلم ۴) ''اور یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر ہو۔''

عظمت اخلاق کا یہ تاج زریں خصائص نبوی میں شمار کیا جاتا ہے اس لئے کہ از آدم تا ایں آدم بارگاہ رب العالمین سے کسی کو فضل وکمال کی وہ سند نہیں مرحمت فرمائی گئی جو خاتم الانبیاء ﷺ کو دی گئی۔ تشریف آوری آپ سے پہلے بھی انبیائے کرام علیہم السلام کی ہوتی رہی اور قرآن کریم نے اکثر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خاص خاص اوصاف بھی بیان کئے، مگر حق یہ ہے کہ ان نفوس قدسیہ کے اخلاق حسنہ پر کسی مومن کو معمولی سا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ مگر حضور اکرم ﷺ کو فضائل وکمالات کی ایسی جامعیت بخشی گئی جو کہیں اور نظر نہیں آتی۔

یہ سارے اوصاف اس بات کے متقاضی تھے کہ جس ذات اقدس پر اللہ تعالیٰ کے ان سارے انعامات کی تکمیل ہوئی اس کی سیرت اور اس کے اخلاق بھی اس مرتبۂ کمال کے ہوں کہ رہتی دنیا تک وہ نمونہ مثال بن جائے اور اس کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہو جس میں کسی عہد اور کسی قرن، کسی نسل اور کسی آبادی، غرض پوری نوع انسانی کیلئے روشنی اور ہدایت موجود نہ ہو۔ اگر بندگی ہو تو اس عبد کامل کی سی، جس کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ خود اپنا بندہ کہہ کر نوازے، اگر صبر ہو تو ایسا کہ اخلاقیات کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر رفعت وکمال کا مظاہرہ نہ کبھی ہوا ہو اور نہ قیامت تک ممکن ہو۔ اگر رافت ورحمت، ہمدردی، دلسوزی، استقامت واستقلال عزت نفس اور عجز وانکسار، شجاعت اور اولوالعزمی ہو تو ایسی کہ دوست ہی نہیں دشمن کو بھی اعتراف ہو، صدق اور راست بازی اس مرتبے کی ہو جو اس سے اعلیٰ وارفع مقام پر چشم عالم نے آج تک کسی بشر کو نہ دیکھا ہو، اس کمال کی طرف حدیث نبوی ﷺ کے یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں کہ:

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ .

ترجمہ: میں تو اس لئے مبعوث ہوا ہوں کہ فضائلِ اخلاق کو مرتبۂ کمال تک پہنچادوں۔

دیگر انبیائے کرام علیہم السلام بلاشبہ فضائل واخلاق سے آراستہ تھے مگر اخلاق کو درجۂ کمال تک پہنچانے کا شرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے آپ ہی کو بخشا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کی تشریف آوری نہ ہوتی تو اخلاق اور اس کے محاسن کا شعور تو ضرور ہوتا مگر اس کے مرتبۂ کمال کا تصور نہ ہوتا۔

خداوند تعالیٰ نے جس طرح دین کی تکمیل کا اعلان فرما کر ساری دنیا کو متنبہ کردیا کہ اب کسی نبی کی بعثت اور کتاب کا نزول نہ ہوگا۔ اسی طرح " انک لعلیٰ خلق عظیم " کہہ کر یہ بھی بتادیا کہ اب اس سے بڑھ کر کمالِ اخلاق کا کوئی اور مرتبہ نہیں ہے۔

اگر تاریخ عالم میں سارے انسانوں کیلئے کسی کے اخلاق کو قابل تقلید نمونہ کہہ سکتے ہیں تو وہ آنحضرت ﷺ ہی کا اخلاق حسنہ ہے۔

ختم نبوت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ط (الاحزاب۔۴۰)

"(مسلمانو!) محمد (ﷺ) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں، اور تمام نبیوں میں سب سے آخری نبی ہیں۔"

تمام مفسرین خاتم النبیین کے معنی آخری نبی بیان کرتے ہیں، ختم نبوت کے سلسلے میں تنہا یہی ایک آیت نہیں ہے بلکہ دوسری آیات میں بھی اشارے موجود ہیں۔ آپ پر سلسلہ نبوت کے اختتام کی دلیل یہ بھی ہے کہ آپ ساری نوع انسانی کیلئے ذریعۂ ہدایت بنائے گئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانبیاء۔۱۰۷)

یعنی: "اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں سارے جہانوں کیلئے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

جب آپ کی ہمہ گیر اور آخری رسالت و نبوت کا اظہار قرآن پاک، دین کی تکمیل، نعمتوں کے اتمام، آپ کی رحمت جہاں ہونے کے اعلان، اور رہتی دنیا تک کیلئے نوع بشر کیلئے ذریعہ ہدایت کہہ کر کر رہا ہے تو پھر کسی اور نبی کے تصور کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟

اللہ کے فیصلے اور اس کی رضا کے علم کا دوسرا بڑا ذریعہ ہمارے پاس حدیث ہے جس میں صراحت کے ساتھ آپ نے سلسلۂ نبوت و رسالت کے ختم ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔

ترمذی میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ میرے بعد اب کوئی رسول ہے، نہ کوئی نبی۔ یہ اور اس طرح کی بکثرت احادیث صحاح صاف اور صریح الفاظ میں آئی ہیں۔

قرآن وسنت کے بعد تیسرا درجہ اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور جن لوگوں نے ان کی نبوت کو تسلیم کیا ان سب کے خلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بالاتفاق جنگ کی۔

قرآن وسنت کی رو سے نبوت کا مسئلہ ایمانیات اور اعتقادات میں اساسی اہمیت رکھتا ہے بلکہ صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ کفر اور اسلام سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی واقعی اللہ کا رسول یا نبی ہے، اور خاکم بدھن اگر ہم اس کا انکار کرتے ہیں تو ہمارے ایمان کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے اور ہم کافر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے الوہیت، رسالت، وحی اور آخرت ہی پر یقین کا نام ایمان ہے۔ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی اگر ہمارے یقین اور ایمان میں کوئی معمولی سا فتور موجود ہے تو ہم مومن نہیں ہو سکتے۔ اور نبوت کے مسئلے کو مذاق بنانے والی قومیں کبھی ہدایت نہیں پا سکتیں، کتاب و رسالت ہی تو اصل سرچشمۂ ہدایت ہے اور اگر رسالت اور نبوت ہی کے سلسلے میں ہمارا ذہن صاف نہ ہو تو ہمیں کبھی منزل حق نصیب نہیں ہو سکتی۔

نبیٔ کریم ﷺ کے حقوق

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ ۝ (الرعد۔۷)

"اور ہر قوم کیلئے کوئی نہ کوئی ایسا شخص ہوا ہے جو ہدایت کا راستہ دکھائے۔"

دینِ اسلام کے بنیادی عقائد میں توحید کے بعد رسالت اور نبوت کا مقام ہے۔ اللہ رب العزت نے ہمیشہ ہر قوم میں سے ایسے سچے راہ نما بھیجے جنہوں نے اولادِ آدم کی راہ نمائی کی اور ان کو حق وصداقت کی راہ دکھائی۔

نبی کریم ﷺ کے جو حقوق ایک امتی کے ذمے ہیں ان کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) محبت (۲) متابعت (اطاعت) (۳) عظمت۔ یہ تینوں حقوق ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا پایا جانا ناممکن ہے۔

معاشرے میں ایک گروہ جو محبت رسول ﷺ کا مدعی ہے اس کے متعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی تعداد معاشرے میں زیادہ ہے جو کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ نبی کریم ﷺ کے زبانی فضائل بیان کرنے کو کافی سمجھتے ہیں۔ نہ اطاعت سے بحث ہے، نہ ان کے دل میں حقیقی محبت ہے، نہ تعظیم۔ کیا یہ لوگ ابن مبارک رحمہ اللہ علیہ کا قول بھول گئے:

لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَاَطَعْتَہٗ

اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

"اگر تیری محبت سچی ہوتی تو، تو اس کی اطاعت کرتا، بے شک عاشق محبوب کا فرماں بردار ہوتا ہے۔"

معاشرے میں دوسرا گروہ وہ ہے جو آپ ﷺ کی عظمت تو کرتا ہے، مگر محبت سے بہت دور ہے۔ آپ ﷺ کی ہر بات میں علت (وجہ) تلاش کرتا ہے، اگر علت عقل میں آجائے تو آپ ﷺ کے حکم کو تسلیم کر لیا اور اگر عقل میں نہ آئے تو انکار کر دیا۔

معاشرے کا تیسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کے دلوں میں آپ ﷺ کی قدر ومنزلت اس درجے کی نہیں جتنی ہونی چاہیئے۔ وہ آپ ﷺ کو ایک اچھا انقلابی لیڈر اور عاقل بادشاہ سمجھتے ہیں اور ضمناً نبی بھی۔

خلاصہ کلام:۔ یہ ہے کہ یہ تینوں جماعتیں پورے حقوق ادا نہیں کرتیں، کسی نے ایک کو لیا دو کو چھوڑ دیا۔ کسی نے دو کو لیا تیسرے کو چھوڑا۔ پس کامیاب صرف وہ شخص ہے جو نبی کریم ﷺ کی محبت متابعت (اتباع) اور عظمت تینوں حقوق کو ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو ان حقوق کو سمجھنے اور ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

”(مسلمانو!) محمد (ﷺ) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں میں سب سے آخری نبی ہیں اور اللہ ہر بات کو خوب جاننے والا ہے۔“ (الاحزاب۔۴۰)

حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اس آیت میں نبی کریم ﷺ کا خاتم النبیین ہونا بیان فرمایا۔ جو حضور پر نور ﷺ کے خاص فضائل اور خصائص میں سے ہے۔ یہ خاصیت آپ ﷺ کے سوا اور کسی نبی کو عطا نہیں کی گئی۔ جیسا کہ ایک حدیث مبارکہ میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: مجھے تمام انبیاء پر چھ چیزوں کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے:

(۱) مجھ کو ایسے جامع کلمات دیئے گئے ہیں کہ لفظ تو بہت کم ہیں اور معنیٰ بہت زیادہ۔

(۲) میری مدد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس طرح فرمائی کہ دشمنوں کے دلوں میں میرا رعب ڈال دیا۔

(۳) مالِ غنیمت میرے لئے حلال کر دیا گیا (جو کہ) مجھ سے پہلے کسی کیلئے حلال نہ تھا۔

(۴) تمام زمین میرے لئے سجدہ کی جگہ اور پاکی کا ذریعہ بنا دی گئی۔

(۵) مجھ کو تمام مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا یعنی میری بعثت تمام عالم (دنیا) کیلئے ہے، کسی خاص قوم کیلئے نہیں۔

(۶) میں خاتم النبیین ہوں، مجھ پر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

مطلب یہ ہے ”خاتم النبیین“ ہونا آپ ﷺ کی خاص خصوصیت اور فضیلت ہے۔ اب قیامت تک آپ ﷺ کے بعد کسی کو نبوت عطا نہیں ہوگی اس لئے کہ آپ ﷺ کا دین اور آپ ﷺ کی شریعت کامل ہے اور تمام گزشتہ ادیان اور شریعتوں کو منسوخ کرنے والی ہے۔ اب قیامت تک آپ ﷺ کی امت کے علماء انبیائے بنی اسرائیل کی طرح آپ ﷺ کی شریعت سے عالم (دنیا) کی راہ نمائی کرتے رہیں گے۔

نبی کریم ﷺ نے ختم نبوت کی فضیلت کو ایک مثال سے واضح فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میری مثال اور گذشتہ پیغمبروں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے نہایت عمدہ مکان بنایا اور اس کو خوب آراستہ کیا مگر اس کے ایک کونہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی اور لوگ اس مکان کے اردگرد آ کر گھومنے لگے اور تعجب کرنے لگے کہ یہ اینٹ بھی کیوں نہ لگا دی کہ مکان بالکل مکمل ہو جاتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس قصرِ نبوت کی آخری اینٹ میں ہوں جس سے وہ محل پورا ہوا اور میں خاتم النبیین ہوں۔“ (بخاری و مسلم)

مطلب یہ ہے کہ قصرِ نبوت بالکل مکمل ہو چکا ہے اب اس میں کسی تشریعی نبوت کی اینٹ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

بجھے ذہنوں کا رنگ اترا، ستے چہروں پہ نور آیا
حضور ﷺ آئے تو انسانوں کو جینے کا شعور آیا

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (النسآء۔۵۹) ”اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو۔“

حضور ﷺ کے حسن و جمال میں غور کرنے سے دل میں حضور علیہ السلام کی محبت بڑھتی ہے، جس کا پہلا حق آپ علیہ السلام کی اطاعت ہے کہ ہم آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک ایک حکم کو مانیں۔ آپ ﷺ کی سنتوں کو عملی زندگی میں زندہ کریں، ورنہ محض زبانی محبت ظاہر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں حضور اکرم ﷺ سے واقعی محبت ہے تو ہم کچھ کر کے دکھائیں، اپنی شکل وصورت سنت کے مطابق رکھیں، کھانا پینا، ملنا جلنا سب سنت کے مطابق اختیار کریں۔ کیونکہ جس کو جس سے محبت ہوتی ہے وہ اس کے مطابق بننے اور اس کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی اس کے سچے اور محب ہونے کی علامت ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین حضور اکرم ﷺ کے سچے عاشق تھے۔ انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کمال اتباع کے ساتھ آپ کی محبت وعقیدت سے سرشار ہو کر آپ ﷺ کے جسم مبارک کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آپ ﷺ کے حسن و جمال جسم کے اعضا میں سے ہر چیز کے بارہ میں اوصاف ذکر فرمائے ہیں جو ”حلیہ مبارک“ کے نام سے معروف ہے۔ اس کے مطالعہ کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہر لحاظ سے بے مثال نمونہ ہے۔ آپ ﷺ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

حضور ﷺ کا حقیقی امتی ہونے کیلئے آپ ﷺ کی سنتوں، آپ ﷺ کی اداؤں اور آپ ﷺ کی عادات سے دلی محبت ضروری ہے۔ اس بارہ میں حضور ﷺ کا خود ارشاد ہے:

اے میرے بیٹے! (انس) اگر تجھ سے ہو سکے کہ صبح وشام اس حالت میں بسر کرو کہ تمہارے دل میں کسی شخص سے کینہ نہ ہو تو ایسا ہی کرو پھر آپ ﷺ نے فرمایا اے میرے بیٹے! یہی میری سنت ہے اور جس نے میری سنت سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (ترمذی)

یقین کیجئے! ایک مسلمان کی اصل زندگی وہی ہے جو سنت کے مطابق ہو، محبوب دو عالم ﷺ کی اداؤں سے آراستہ ہو۔ اس مقصد کیلئے رحمت کائنات ﷺ کے فضائل حمیدہ کا مطالعہ کیجئے اور آپ ﷺ کی ایک ایک عادت طیبہ کو اختیار کر کے ہمیشہ کیلئے ان کو اپنا لیجئے۔

اخلاقیات کے باب میں حضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کے اخلاق حسنہ کو اختیار کریں اور آپ ﷺ کی سنتوں کو عمل میں لائیں اور ثواب عظیم حاصل کریں۔ اس کے نتیجے میں جو آپ ﷺ کی سچی اور پکی محبت دل میں پیدا ہوگی وہ ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہوگی۔ لہٰذا آپ ﷺ کے اتباع کی بھرپور کوشش کرنی چاہیئے اور زبان پر بکثرت درود و سلام جاری رکھنا چاہیئے کہ محبتِ رسول کا یہی پہلا حق ہے۔

یا اللہ! ہمیں رحمتِ دو عالم ﷺ کی کمال محبت اور کمال اطاعت عطا فرما اور ہمیں محبتِ رسول ﷺ کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی ہمیں ہمت نصیب فرما۔ (آمین)

عقیدہ حیاۃ النبی ﷺ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (البقرہ ۔۱۵۴)

''اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوں ان کو مردہ نہ کہو۔ دراصل وہ زندہ ہیں مگر تم کو (ان کی زندگی کا) احساس نہیں ہوتا۔''

قرآن پاک میں شہداء کے بارہ میں حیات ثابت ہے اور تم بھی مانتے ہو تو انبیاء علیہم السلام کی حیات بطریق اولیٰ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے عصا کو کیڑوں نے تختی کے باوجود کھالیا لیکن ان کے جسم کو نرمی کے باوجود بھی نہیں کھایا، کیونکہ ان کے جسم اطہر میں حیات موجود تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دفن کے تین دن بعد ایک بدوی نے روضۂ اقدس ﷺ پر حاضر ہو کر اس آیت کریمہ (وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ) سے مغفرت طلب کی۔ روضہ اطہر سے صدا آئی: ''انہ قد غفر لک۔'' (تفسیر قرطبی ج ۵۔ص ۲۶۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''(حضرات) انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز بھی ادا فرماتے ہیں۔'' (بیہقی حیات الانبیاء)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میرا معراج کی رات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر گزر ہوا تو وہ سرخ ٹیلے کے پاس اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ (صحیح مسلم ج ۲۔ص ۲۶۸)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں اپنے اس کمرہ میں جس میں حضور اقدس ﷺ مدفون ہیں بلا حجاب داخل ہو جاتی تھی اور سمجھتی تھی کہ اس کمرے میں ایک تو میرے شوہر ہیں اور دوسرے میرے والد صاحب۔ پس جب ان کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تدفین ہوئی تو اللہ کی قسم! میں اس حجرہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حیاء کی وجہ سے بغیر پردہ کبھی بھی نہ جاتی تھی۔ علامہ طیبی شارح مشکوٰۃ شریف فرماتے ہیں: اس حدیث میں ایک امر کی دلیل ہے کہ میت کا احترام بھی اسی طرح کیا جائے جس طرح زندگی میں کیا جاتا تھا۔ (مشکوٰۃ ص ۱۵۴ شرح طیبی ج ۳۔ص ۴۱۸)

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ واقعۂ حرہ میں حضور اقدس ﷺ کی قبر شریف سے اذان واقامت کی آواز سنتا رہا یہاں تک کہ لوگ واپس آگئے۔ (خصائص کبریٰ ج ۲۔ص ۲۸۱)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا:

''مات رسول اللہ ﷺ۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو ظاہر موت بھی نہیں آئی بلکہ آپ جو آرام کر رہے ہیں ابھی اٹھ جائیں گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ظاہری موت تو آئی ہے اور آیت ''افائن مات'' سے یہی مراد ہے۔

حقیقت میں رسول اللہ ﷺ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور شہداء زندہ ہیں۔ شہداء صریح آیت سے اور رسول اللہ ﷺ دلالۃ النص سے۔

توہینِ رسالت ناقابل معافی جرم ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

مَّلْعُوْنِیْنَ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ۝ (الاحزاب۔۶۲) ”جن میں وہ پھٹکارے ہوئے ہوں گے۔(پھر) جہاں کہیں ملیں گے، پکڑ لئے جائیں گے، اور انہیں ایک ایک کر کے قتل کر دیا جائے گا۔“

یہ تو ان کی دنیا کی رسوائی ہے اور آخرت کی رسوائی تو اس سے بھی سخت ہوگی۔ بہت سے لوگ اس کشمکش میں مبتلا ہیں کہ آیا توہینِ رسالت کا جرم قابل معافی ہے یا نہیں۔ نیز یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ حضور ﷺ تو سراپا شفقت و رحمت تھے اور اپنی ذات کیلئے بدلہ نہیں لیتے تھے تو پھر یہ مسلمان حضور ﷺ کے گستاخ کو معاف کرنے کیلئے کیوں تیار نہیں؟ اور اس طرح کی دیگر باتیں لکھی اور کہی جا رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں مختصراً اتنا عرض کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کو تکلیف دینے والے لوگ دو قسم کے تھے۔ بعض جسمانی ایذاء پہنچاتے تھے مثلاً پتھر مارنا، راستے میں کانٹے بچھانا وغیرہ اور بعض ایسے لوگ تھے جو نبوت و رسالت کا مذاق اڑا کر تکلیف پہنچاتے تھے۔ اول الذکر لوگوں کو آپ ﷺ نے اگرچہ معاف فرما دیا تھا لیکن ثانی الذکر کو آپ ﷺ نے معاف نہیں فرمایا۔ چنانچہ کعب بن اشرف یہودی ابن خطل وغیرہ کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو خود روانہ فرمایا تھا۔ نبی ﷺ کی گستاخی پر درجنوں عورتوں، باندیوں، مردوں حتیٰ کہ حجاز کے بڑے تاجر ابو رافع یہودی سردار کعب بن اشرف نیز 120 سالہ بوڑھے یہودی سردار کو معاف نہیں کیا گیا۔ ابن خطل اور اس کی باندی جو ہجو نبی کے مجرم تھے ان کو مقدس شہر اور استارِ کعبہ نے بھی پناہ نہیں دی۔ چودہ سو سال بعد جب حکومت بھی غیروں کی تھی، غازی علم الدین اور غازی عبدالقیوم اور ان جیسے درجن بھر عشاقِ رسول نے گستاخانِ رسول کو ٹھکانے لگایا۔

کراچی میں غازی عبدالقیوم نے جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے انگریز جج کے سوال کا جواب دیا تھا کہ اس کو گالی دینا آپ کو گوارا نہیں تو اپنے آقا محمد رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی ان کا غلام کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ نبی ﷺ نے اعلان فرما دیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ: میری محبت اولاد، باپ، ماں اور سب پیاروں سے زیادہ ہو تو پھر مکمل ایمان ہوگا۔

جس کی وجہ علمائے امت نے یہ لکھی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذاتی و شخصی توہین بھی اگرچہ قبیح درجہ کا کفر، حرام اور جرم قبیح ہے لیکن اس کے ساتھ یہ اس ذاتِ عالی یعنی حق تعالیٰ شانہٗ کی بھی تنقیص ہے جس نے آپ ﷺ کو منصب رسالت سے سرفراز فرمایا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کو جن بدبختوں نے ذاتی طور پر ایذا پہنچائی، آپ ﷺ نے اپنے خلق عظیم کی بنا پر انہیں معاف فرما دیا۔ لیکن جن گستاخ لوگوں نے انتخابِ ربانی کا تمسخر اڑایا وہ ناقابلِ معافی قرار دیئے گئے اور ایسا کرنا آپ ﷺ کا فرضِ نبوت تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ گستاخِ رسول کو سزا ملنی چاہیئے۔ چنانچہ عالمِ اسلام کے مشہور محقق شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”السیف المسلول علی شاتم الرسول“ میں قرآن و حدیث اور اجماع امت کے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ گستاخِ رسول کی سزا قتل ہے، اگرچہ وہ توبہ ہی کیوں نہ کر لے۔ توبہ کی برکت سے عذاب آخرت سے تو نجات ہو جائے گی تاہم دنیوی سزا سے معافی نہیں دی جا سکتی۔ تاکہ توہینِ رسالت کا باب نہ کھلے۔ اگر گستاخِ رسول کو معافی دے دی جائے تو جہاں ایک طرف توہینِ رسالت کا دروازہ کھلے گا اس کے ردعمل کے طور پر غازی علم الدین شہید جیسے افراد پیدا ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورتِ حال معاشرہ کیلئے انتہائی پریشان کن ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہم سب کو باادب بنائے اور ہر قسم کی بے ادبی و گستاخی سے بچائے۔ (آمین)

توہینِ رسالت ناقابل معافی جرم ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

مَّلْعُوْنِیْنَ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ۝ (الاحزاب۔۶۲) ”جن میں وہ پھٹکارے ہوئے ہوں گے۔(پھر) جہاں کہیں ملیں گے، پکڑ لئے جائیں گے، اور انہیں ایک ایک کر کے قتل کر دیا جائے گا۔“

یہ تو ان کی دنیا کی رسوائی ہے اور آخرت کی رسوائی تو اس سے بھی سخت ہوگی۔ بہت سے لوگ اس کشمکش میں مبتلا ہیں کہ آیا توہینِ رسالت کا جرم قابل معافی ہے یا نہیں۔ نیز یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ حضور ﷺ تو سراپا شفقت و رحمت تھے اور اپنی ذات کیلئے بدلہ نہیں لیتے تھے تو پھر یہ مسلمان حضور ﷺ کے گستاخ کو معاف کرنے کیلئے کیوں تیار نہیں؟ اور اس طرح کی دیگر باتیں لکھی اور کہی جا رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں مختصراً اتنا عرض کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کو تکلیف دینے والے لوگ دو قسم کے تھے۔ بعض جسمانی ایذاء پہنچاتے تھے مثلاً پتھر مارنا، راستے میں کانٹے بچھانا وغیرہ اور بعض ایسے لوگ تھے جو نبوت و رسالت کا مذاق اڑا کر تکلیف پہنچاتے تھے۔ اول الذکر لوگوں کو آپ ﷺ نے اگرچہ معاف فرما دیا تھا لیکن ثانی الذکر کو آپ ﷺ نے معاف نہیں فرمایا۔ چنانچہ کعب بن اشرف یہودی ابن خطل وغیرہ کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو خود روانہ فرمایا تھا۔ نبی ﷺ کی گستاخی پر درجنوں عورتوں، باندیوں، مردوں حتیٰ کہ حجاز کے بڑے تاجر ابو رافع یہودی سردار کعب بن اشرف نیز 120 سالہ بوڑھے یہودی سردار کو معاف نہیں کیا گیا۔ ابن خطل اور اس کی باندی جو ہجو نبی کے مجرم تھے ان کو مقدس شہر اور استارِ کعبہ نے بھی پناہ نہیں دی۔ چودہ سو سال بعد جب حکومت بھی غیروں کی تھی، غازی علم الدین اور غازی عبدالقیوم اور ان جیسے درجن بھر عشاقِ رسول نے گستاخانِ رسول کو ٹھکانے لگایا۔

کراچی میں غازی عبدالقیوم نے جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے انگریز جج کے سوال کا جواب دیا تھا کہ اس کو گالی دینا آپ کو گوارا نہیں تو اپنے آقا محمد رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی ان کا غلام کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ نبی ﷺ نے اعلان فرما دیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ: میری محبت اولاد، باپ، ماں اور سب پیاروں سے زیادہ ہو تو پھر مکمل ایمان ہوگا۔

جس کی وجہ علمائے امت نے یہ لکھی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذاتی و شخصی توہین بھی اگرچہ قبیح درجہ کا کفر، حرام اور جرم قبیح ہے لیکن اس کے ساتھ یہ اس ذاتِ عالی یعنی حق تعالیٰ شانہٗ کی بھی تنقیص ہے جس نے آپ ﷺ کو منصب رسالت سے سرفراز فرمایا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کو جن بدبختوں نے ذاتی طور پر ایذا پہنچائی، آپ ﷺ نے اپنے خلق عظیم کی بنا پر انہیں معاف فرما دیا۔ لیکن جن گستاخ لوگوں نے انتخابِ ربانی کا تمسخر اڑایا وہ ناقابلِ معافی قرار دیئے گئے اور ایسا کرنا آپ ﷺ کا فرضِ نبوت تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ گستاخِ رسول کو سزا ملنی چاہیئے۔ چنانچہ عالمِ اسلام کے مشہور محقق شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”السیف المسلول علی شاتم الرسول“ میں قرآن و حدیث اور اجماع امت کے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ گستاخِ رسول کی سزا قتل ہے، اگرچہ وہ توبہ ہی کیوں نہ کر لے۔ توبہ کی برکت سے عذاب آخرت سے تو نجات ہو جائے گی تاہم دنیوی سزا سے معافی نہیں دی جا سکتی۔ تاکہ توہینِ رسالت کا باب نہ کھلے۔ اگر گستاخِ رسول کو معافی دے دی جائے تو جہاں ایک طرف توہینِ رسالت کا دروازہ کھلے گا اس کے ردعمل کے طور پر غازی علم الدین شہید جیسے افراد پیدا ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورتِ حال معاشرہ کیلئے انتہائی پریشان کن ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہم سب کو باادب بنائے اور ہر قسم کی بے ادبی و گستاخی سے بچائے۔ (آمین)

اللہ کے حقوق

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (الفاطر۔۳) ''کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے۔''

اسلام نے حقوق کی دو قسمیں بتائی ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد، چونکہ حقوق تعلق کی بنا پر عائد ہوتے ہیں، اس لئے سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تعلق اپنے بندوں سے کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے بندوں پر اپنے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے جس اساسی اور بنیادی تعلق کا اظہار فرمایا ہے وہ ایجاد خلق کا رشتہ، یعنی وہ ہمارا ہی نہیں بلکہ ساری کائنات کا خالق ہے اور ہم ہی نہیں بلکہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ کائنات کا ایسا خالق اور موجودات کا ایسا صانع ہے کہ ان کو پردۂ عدم سے وجود میں لانا پھر فنا کر دینا اور پھر وجود عطا کرنا، سب کچھ اس کی قدرت میں ہے۔ وہ ایسی حکمت والا خالق و صانع ہے کہ اپنی مصنوعات کے ذرے ذرے سے پوری طرح باخبر ہے۔ عالم ایجاد کی ہر چیز اس کی تخلیق کی رہین منت ہے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے قرآن حکیم میں ایک دو مقام پر نہیں اکثر و بیشتر مقامات پر اپنی صفتِ خلق کا تذکرہ کیا ہے، اس کا خالق ہونا جہاں اور بہت سی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں عقل سلیم کی رہنمائی اس طرف بھی کرتا ہے کہ جو خالق ہے، وہی مالک بھی ہے اور مخلوق اپنے خالق کی مملوک ہے۔ اس لئے کہ ممکن نہیں کہ خالق کوئی اور ہو اور مالک کوئی اور ہو۔ یہاں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان رشتہ خالق اور مخلوق کا ہے۔ مالک و مملوک کا ہے، خالق کا اپنی مخلوق پر اولین حق یہ ہے کہ وہ اس کو اپنا خالق سمجھے۔ اس لئے کہ اس سے بڑھ کر احسان ناشناسی نہیں ہو سکتی کہ ہم العیاذ باللہ، اپنے خالق ہی کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ خالق کو تسلیم نہ کرنا درحقیقت اپنے وجود کا انکار ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔ ''اے ایمان والو! اللہ پر ایمان رکھو، اور اس کے رسول پر۔''

ایمان ایسا مکمل ہو جس میں اس کی قدرت اور اس کی ملکیت کی قولاً یا فعلاً کسی طرح نفی نہ ہوتی ہو۔ اگر کوئی شخص اس پر، اس کی تمام قدرتوں اور صفتوں کے ساتھ پورا یقین نہیں رکھتا تو اس کا ایمان مکمل نہیں۔ اور جب ایمان مکمل نہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا پہلا حق ادا نہ کر سکے۔

دوسرا حق اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنی کتاب میں فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریات۔۵۶)

''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔''

عبادت اور بندگی اللہ تعالیٰ کا دوسرا حق ہے۔ یہ عبادت اور بندگی کا تصور پوری زندگی پر محیط ہے۔ معاملات، عبادات، فرد اور جماعت کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہو جو اس کی خالص بندگی کے تصور سے محروم ہو۔ یہی وہ حق ہے جس کا تذکرہ قرآن شریف میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ (ہود۔۲) '' اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔''

حقیقت یہ ہے کہ اس کے حقوق ہم پر اس کی نعمتوں کی وجہ سے بھی ہیں۔ خود اپنی زندگی پر غور فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ ہر سانس، اس کی ایک نعمت بے کراں ہے۔ اس نے جسم بخشا، روح بخشی، بصارت دی، بصیرت عطا فرمائی، عقل و فہم کی دولت سے نوازا اور ایسی لاتعداد نعمتیں عطا فرمائیں جن سے اس کی دوسری مخلوقات محروم ہیں۔ انہی نعمتوں کی بنا پر اس کا حق یہ بھی ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ محبت صرف تقاضائے ایمان ہی نہیں بلکہ تقاضائے کرم و احسان بھی ہے۔ اس کی رافت، شفقت، ربوبیت، سب کچھ ہم سے محبت کا تقاضا کرتی ہے۔

بندگی نعمتِ خداوندی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ (الفاتحہ۔۴) یعنی: ''(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

لہٰذا عبدیت اور بندگی اگر جائز ہو سکتی ہے تو صرف اس قادرِ مطلق، اس ذاتِ یکتا کی جس نے انسان کو پیدا کیا اور اپنی نعمتوں سے نوازا۔ جس نے انسان کو کائنات میں افضل ترین مقام عطا کیا۔ جس نے انسان کو اپنا نائب بنا کر خلافتِ ارضی سے سرفراز کیا جس نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری تخلیق کا مقصد بھی بتا دیا کہ جن اور انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریات۔۵۶)

''اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔''

عبادت کیا ہے؟ اسلام میں عبادت کا مفہوم پوجا پاٹ اور محض رسمی عبادات کا ادا کر لینا نہیں ہے، عبادت ایک جامع لفظ ہے۔ اس میں وہ تمام ظاہری، باطنی اعمال واقوال داخل ہیں جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، سچائی، حق گوئی، امانت، دیانت، وعدہ وفائی، مخلوق خدا کے ساتھ ہمدردانہ سلوک، حقوق العباد، نیکی کی تلقین، بدی سے پرہیز، انصاف، اخلاص، صبر، تحمل وغیرہ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تمام زندگی، عبادت ہو سکتی ہے، اگر وہ تسلیم رضا کے ساتھ بسر کر جائے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانعام:۱۶۲)

یعنی کہہ دو کہ: ''بیشک میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کیلئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

ہم اس عبادت کو اس انداز پر بھی سوچ سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے تمام اعمال اگر ایک عبد اور ایک بندے کی حیثیت سے انجام دیئے جائیں تو وہ عبادت میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ چاہے بظاہر وہ کتنے ہی دنیاوی کام معلوم ہوتے ہیں، مثلاً: کسب معاش ایک ایسا فعل جس کو خالص دنیادارانہ کہا جائے گا۔ لیکن اگر فرض شناسی، دیانت داری اور خدا ترسی کے ساتھ روزی کمائی جائے اور اس کے ذریعے اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی پوری کی جائیں تو اس دنیادارانہ فعل میں بھی عبادت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے کام بھی جو حدود اللہ کے اندر انجام دیئے جائیں، عبادت کا درجہ رکھتی ہیں۔ گویا عبادت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان کو ایک مقصدِ زندگی حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک عبد اور بندہ اپنے بہت سے معاملات میں فکر مند نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اللہ سے مانگتا ہے اور اسی سے امید رکھتا ہے۔ یہ طرزِ فکر اس میں بے نیازی پیدا کر دیتا ہے، بے نیازی انسان کو بہت سی پریشانیوں سے بچاتی ہے، اور خود اعتمادی و خود شناسی پیدا کرتی ہے۔ ایک بندہ جب اپنے معبود سے آرزو کرتا ہے تو وہ معبود کے قریب ہو جاتا ہے۔ آرزومندی اپنی جگہ ایک جنس گراں بہا ہے جو ایک عبد اور بندے کو ہی میسر ہو سکتی ہے۔ بقول علامہ اقبال رحمہ اللہ:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

محبتِ الٰہی کا معیار

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران۔۳۱)

یعنی: ”اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

تمام عبادات کی غایت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا قرب اور اس کی محبت ہے۔ اس لئے بندے کا مطلوب اللہ عزوجل ہے، اس طرح اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی محبت انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ ہوا۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر ان تدابیر کو واضح کیا ہے جو بندے کے دل میں اللہ کی محبت پیدا کر سکتی ہیں۔ ایک آدمی دوسرے آدمی سے محبت کرتا ہے، ماں باپ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، انسان بعض جانوروں سے بھی محبت کرتا ہے۔ بعض پودے اور پھول بھی اس کے دل کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ محبت کی یہ تمام صورتیں مخلوقات کے درمیان ہیں، لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات واحد ہے، ”لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ“ یعنی کوئی اس کا مثل نہیں ہے۔ انسان اللہ کی ذات کا کوئی تصور تک قائم نہیں کر سکتا۔ اس لئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے محبت کا معیار بالکل مختلف اور جدا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے بندوں سے اس سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے جتنی محبت والدین اپنے بچوں سے کرتے ہیں۔ مگر ان دونوں قسموں کی محبت کا معیار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کی بنیاد یہ ہے کہ اسے واحد اور احد مانا جائے اور دل میں یہ ایمان جاگزیں کیا جائے کہ وہی سارے عالم کا خالق ہے۔ اور وہی سب کا رب ہے، اس کی ربوبیت میں کوئی اور شریک نہیں ہے۔ وہی زندہ رکھتا ہے، وہی رزق دیتا ہے، وہی تندرست رکھتا ہے اور وہی شفا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام صفتوں کی غیر اللہ سے نسبت کی نفی کی جائے کیونکہ صرف وہی ان کا مستحق ہے۔ انسان کا یہ مقام ہے کہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا تمام دوسری طاقتوں کی پرستش سے دامن کو آلودہ نہ کرے۔ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علاوہ کسی دوسری ہستی سے کوئی امید نہ رکھے، کوئی مدد نہ چاہے۔ اس طرح تمام غیر اللہ سے منہ موڑ کر صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ہو رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی محبت کا معیار یہ ہے کہ اس کے احکام کی بے چوں وچراں اور بہ رضا و محبت تعمیل کی جائے۔ یہی اس کی محبت کا معیار ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اس نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح الفاظ میں یوں فرمایا کہ اگر بندہ چاہتا ہے کہ اللہ اس سے محبت کرے تو وہ اللہ کے رسول کی کامل اور مکمل اطاعت کرے۔ جن باتوں کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرے اور جن باتوں سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے ان سے باز رہے۔ اس کھلے ہوئے حکم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا معیار یہ ہے کہ اس کے محبوب ترین بندے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کی جائے۔ اگر کوئی بندہ نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کے بغیر اللہ کی محبت کا متمنی ہے تو وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، جب واحد پسندیدہ راہ پر عمل اسلام کی مقرر کردہ ہے تو پھر کوئی دوسری راہ اللہ کی محبت کی جانب انسان کی رہبری نہیں کر سکتی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی پوری اطاعت کریں، تاکہ اللہ کی محبت حاصل ہو اور

محبتِ الٰہی کے تقاضے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (البقرۃ۔۱۶۵) ''اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔''

اپنے محسن سے محبت، اس سے لگاؤ اور اس کی چاہت انسان کی گھٹی میں ہے۔ جس طرح انسان کا سب سے بڑا محسن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہے، اسی طرح احسان مندی میں مومن کا کوئی مقابل نہیں۔ انسان کی زندگی میں خدا تعالیٰ سے محبت کے مظاہر ہمیشہ سے نمایاں رہے ہیں، اور وہ لوگ جنھوں نے اپنی زندگی کی راہیں خود متعین کرنے کی جسارت کی ان کو بھی اس جذبۂ محبت کے اظہار کیلئے اپنی طرف سے طریقے گھڑنے پڑے چونکہ یہ طریقے خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں تھے، اس لئے انسانی فطرت کے مطابق بھی ثابت نہیں ہوئے۔

مثلاً انسان نے یہ سوچا کہ خدا سے محبت کے اظہار کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آدمی مردم بیزار ہو جائے اور یہ سوچ کر وہ جنگلوں میں جا بسا۔ اس نے سوچا کہ خدا سے محبت کا اظہار خود کو فنا کر دینے کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکتا تو اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے برخلاف قرآن نے اللہ سے محبت کا جو طریقہ بتایا ہے وہ یہ ہے: ''اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ'' (ال عمران۔۳۱) ''اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

اس کا مطلب یہ کہ اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے محبت کے اظہار کا صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کے نتیجے میں خود اللہ بھی بندوں سے محبت کا وعدہ فرماتا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ اللہ کن لوگوں سے محبت فرماتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ ''اللہ دوسروں کے ساتھ بھلائی سے پیش آنے والوں سے محبت کرتا ہے۔'' اور فرمایا وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝ ''اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' ایک جگہ فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝ ''یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔'' ایک آیت میں فرمایا: وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ ''اور جو غصے کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کر دینے کے عادی ہیں اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔'' ایک مقام پر فرمایا گیا: وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ ''اور وہ اللہ کی محبت کی خاطر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کن لوگوں سے محبت کرتا ہے اور پھر کون سے اعمال ہیں، کون سے تقاضے ہیں جن کے نتیجے میں یا جن کی جزا یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ ایسے بندوں سے محبت کرتا ہے جو ایسے اعمال کرتے ہیں۔ ہمارے رسول ﷺ کے سب سے زیادہ نمایاں اعمال ہیں، جن کا تعلق بندوں کے ساتھ احسان اور نیک سلوک سے ہے۔ اللہ کی محبت کی عملی راہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے اللہ کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں ہو کر گزرتی ہے۔ جو انسان چاہتا ہے کہ اللہ سے محبت کرے، اسے چاہیئے کہ اللہ کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔ مختصر یہ کہ محبت الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ قرآن پر عمل کریں اور اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال کر تمام دنیا کیلئے اسلامی زندگی اور اسلامی اخلاق واقدار کا نمونہ پیش کریں۔

اللہ سے عہد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ۝ (الرعد۔۲۰)

"(یعنی) وہ لوگ جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں، اور معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔"

یعنی اللہ سے جو عہد ازل میں ہو چکا ہے، جس پر انسان کی فطرت خود گواہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی زبانی عہد لئے گئے ان سب کو پورا کرتے ہیں، کسی کو توڑتے نہیں۔ نیز بذاتِ خود کسی معاملہ میں خدا سے یا بندوں سے جو عہد و پیمان باندھتے ہیں (بشرطیکہ معصیت نہ ہو) اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

ابوداؤد میں رسول کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس پر عہد اور بیعت لی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور پانچ وقت نماز کو پابندی سے ادا کریں گے اور اپنے امراء کی اطاعت کریں گے اور کسی سے کسی چیز کا سوال نہ کریں گے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے تمام بنی آدم کی روحوں سے ازل میں یہ عہد لیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو ہی اپنا رب مانیں گے اور تمام روحوں نے اس پر شہادت دی تھی کہ وہی ان کا رب ہے۔ یہی وہ عہد ہے جسے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے انسانوں کو مخاطب کر کے قرآن حکیم میں یاد دلایا۔ اور سورہ اعراف میں اس امر واقعہ کا اس طرح ذکر کیا کہ یاد کرو جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ان کی پیٹھوں سے ان کی ذات کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا۔ خود ان کے اوپر پوچھا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو انہوں نے اقرار کیا اور کہا ہاں تو ہمارا رب ہے، ہم اس کے گواہ ہیں۔

عالم ارواح میں عہد الست کے متعلق ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ پہلے آدم (علیہ السلام) کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو ان کی اولاد نکلی، پھر اولاد پر ہاتھ پھیرا تو ان کی اولاد نکلی۔ پھر ان سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا کیوں نہیں، آپ ہمارے رب ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے فرمایا کہ یہ عہد اس لئے لیا گیا کہ قیامت کو تم سے نہ کہہ سکو کہ ہم بے خبری میں مارے گئے، ہم کو تو اس کی اطلاع ہی نہ تھی۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے یہ مثال پیش کی گئی ہے کہ جب ہم پیدا ہوئے تھے تو ہمیں کسی لفظ کا پتا نہ تھا۔ آج ہم بے تکلف بولتے ہیں۔ آخر یہ الفاظ کسی نے تو ہم کو سکھلائے تھے لیکن ہمیں یاد نہیں آتا کہ یہ لفظ کس نے بتائے تھے۔ کہاں بتائے تھے۔ لیکن یہ یقین ہے کہ ہم کو کسی نے بتائے ضرور تھے۔

ان میں سے عہد کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کسی سے بیعت یا اقرار کیا جائے اس کا پورا کرنا بھی اسلامی شریعت کے مطابق ضروری ہے۔ اس لئے تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کا پورا کرنا واجب ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روز الست بندوں نے اپنے اللہ سے باندھا اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا اور بنیادی فرض ہے۔ لیکن اس بنیادی معاہدے کے علاوہ وہ چند قول و قرار اور بھی ہیں (جن میں سے کچھ مذکورہ حدیث میں گزر چکے ہیں) جو معاہدے کی تعریف میں آتے ہیں اور جن کا پورا کرنا بھی انسانوں کے فرائض میں شامل ہے۔ ان تمام معاہدوں کی بھی فرضیت و اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔

ذکر اللہ کی کثرت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (جمعہ۔۱۰)

"اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔"

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ذکر کی ہدایت کے ساتھ یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ فلاح کا یہی راستہ ہے کہ ذکر الٰہی میں ہی انسان کی فلاح ونجات پوشیدہ ہے۔ بعض لوگ ذکر اللہ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ فقط زبان سے اللہ اللہ پکارنے کا نام ذکر ہے، یہ بہت محدود تصور ہے۔ ذکر الٰہی بہت وسیع صفت ہے جب آپ کسی ہستی سے محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کو کسی شخصیت سے عقیدت ہو، آپ اس کے فضل وکمال کے معترف ہوں اور مداح اور اس کی صفات کے قائل ہوں تو یہ فطری بات ہے کہ آپ اس کی تحسین کریں گے۔ اس کی عظمت کے گن گائیں گے اور اس کا ذکر کر کے خوش ہوں گے۔ آپ جتنا زیادہ اس شخصیت کا ذکر کریں گے اتنا ہی آپ کا جذبۂ عقیدت بڑھے گا۔ آپ کی محبت میں اضافہ ہوگا اور آپ کا ایمان ترقی کرے گا۔ کیونکہ یہ فطری بات ہے کہ ذکر کی کثرت سے عشق بڑھتا ہے، یاد کرنے سے دل میں محبت کے چراغ روشن ہوتے ہیں اور محبت ہی سے طلب پیدا ہوتی ہے۔ پھر جس ہستی سے محبت وعقیدت ہوتی ہے تو صرف زبان ہی سے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی صفات کو بھی اپنایا جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ذکر کا مطلب بھی یہی ہونا چاہیئے کہ آپ زبان سے بھی صفاتِ الٰہی کے ذکر کریں اور اپنے عمل میں اس کے قریب ہونے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ اور عمل کیلئے کوئی ایک میدان نہیں ہے ہر شعبہ حیات میں اطاعت الٰہی ضروری ہے۔

ذکر الٰہی سے انسان کو سکون ملتا ہے اور اس کا ایمان ترقی کرتا ہے۔ ذکر سے غافل رہنے والے نقصان اٹھاتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ ان کو سکون واطمینان میسر نہیں آتا وہ ہر معاملے میں پریشان رہتے ہیں اور ہر کسی سے ڈرتے ہیں۔ ان میں وہ اعتماد، وہ جرأت، وہ ہمت، اور وہ ثابت قدمی پیدا نہیں ہوتی کہ جو کامیاب اور پرسکون زندگی کیلئے ضروری ہے۔

سرورِ کائنات سرکارِ دوعالم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں قیامت کے دن کن لوگوں کا درجہ بلند ہوگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

"اللہ کا ذکر کرنے والے (لوگوں کا) چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں۔"

ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "اللہ کو یاد کرنے والے کی مثال اور یاد نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔ یعنی یاد کرنے والا زندہ ہے اور یاد نہ کرنے والا مردہ ہے۔" اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ زبان سے ذکر الٰہی ضروری نہیں یا اس کی اہمیت اور افادیت نہیں ہے۔ نہیں زبان سے ذکر الٰہی بھی ضروری ہے کیوں کہ اس طرح بھی عمل کی توفیق ملتی ہے اور احکام الٰہی کی پابندی کی ترغیب ہوتی ہے۔ انسان اللہ کے قریب تر ہوتا جاتا ہے اور غیر اللہ سے دور ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی زبانیں ذکر الٰہی سے تر رہتی ہیں۔

(الف) خشیتِ الٰہی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (ال عمران۔۱۷۵) ''لہٰذا اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کھاؤ، اور بس میرا خوف رکھو۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ خوفِ الٰہی کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہے وہ بڑے سے بڑے گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیئت اجتماعی کی تنظیم میں معاون ضرور ثابت ہوتے ہیں اور تعزیرات کی وجہ سے بڑی حد تک معاشرہ فتنہ وشر سے محفوظ بھی رہتا ہے۔ لیکن قوانین کی موجودگی کے باوجود جرائم نہ صرف سرزد ہوتے ہیں بلکہ آج کی دنیا میں تو ہر طرح کی بے راہ روی اور لاقانونیت میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ غیر مسلم معاشرے میں کردار کی کمزوری پر تو حیرت نہیں ہے لیکن ایمان واسلام کا دعویٰ کرنے والی جماعتوں میں اگر احکام الٰہی کی علانیہ خلاف ورزی ہو تو پھر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ ہمارا ایمان ناپختہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تصور اور قیامت میں اس کے حضور اپنی جواب دہی کا احساس نہیں ہے۔

انسان کے تمام افعال واعمال کے محرکات میں دو ہی جذبے اہم ہوتے ہیں: خوف اور محبت۔ ان دونوں کے لوازم اور نتائج الگ ہیں۔ محبت کے دعوے کا نتیجہ کبھی کبھی انسان کی عملی زندگی میں نافرمانی اور گستاخی کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ محبوب کے کرم پر غایت اعتماد کی وجہ سے محبت کرنے والا اس کے احکام سے غافل بھی ہوجاتا ہے، اس لئے جس کردار کی تعبیر محض محبت کی بنیاد پر ہوگی۔ اس میں توازن نہیں ہوگا اور اسلام کی تو خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں توازن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے پورے نظام زندگی کی روح یہی عدل وتوازن ہے۔ بلاشبہ قرآن کریم مومنوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھی معمور دکھانا چاہتا ہے۔ اس کی رحمت، اس کی رافت، اس کی ربوبیت، اس کی صفت تخلیق اس کی رزق رسانی، اس کی قدرت بے پایاں اور اپنی بندگی اس سے محبت ہی کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن اس عطاء وبخشش کے ساتھ ساتھ اسی نے ہمارے کچھ فرائض بھی مقرر کئے ہیں۔ کچھ ہمیں احکام بھی دیئے ہیں اور بعض باتوں سے دور رہنے کی بھی سخت تاکید کی ہے۔ ان کو مختصراً الفاظ میں ہم حدود اللہ کہہ سکتے ہیں۔

قرآن یہ چاہتا ہے کہ سارے انسان اور خاص طور پر وہ لوگ جو ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کے اندر زندگی گذاریں، ان میں صداقت ہو، پاکبازی ہو اور ان کے اخلاق واعمال منکرات اور ناپسندیدہ باتوں سے محفوظ ہوں۔ یہ صورت صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کے جذبے سے نہیں پیدا ہوگی بلکہ خوف وخشیت سے پیدا ہوگی۔ اس لئے قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ (انبیاء۔۲۸) ''اور وہ اُس کے خوف سے سہمے رہتے ہیں۔'' یعنی صرف ڈرتے ہی نہیں، بلکہ لرزہ براندام رہتے ہیں، ایسا خوف اللہ کی عظمت اور کبریائی کے صحیح علم وتصور سے پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ کے سامنے اپنی جواب دہی کا احساس رکھتا ہوگا۔ جزا وسزا پر پختہ یقین رکھتا ہوگا اور جو یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی ہے۔ وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے، ان پر کرم بھی فرماتا ہے۔ وہ نوازتا بھی ہے اور محروم بھی کرتا ہے۔ وہ یقیناً اس سے محبت بھی کرتا ہوگا اور اس سے ڈرتا بھی ہوگا۔

(ب) خشیتِ الٰہی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (الفاطر۔۲۸) یعنی ”اللہ سے ڈرتے وہی ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔“

یہ ہمیں ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ علم سے یہاں محکم ایمان اور پختہ یقین مراد ہے اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی ساری صفات پر ایمان مراد ہے جو مومن کی رفتار و گفتار، قول و عمل، فکر و خیال، اخلاق و عبادات سب میں خشیت الٰہی کا جذبہ پیدا کرے۔ ظاہر ہے کہ جس انسان کو اللہ تبارک و تعالیٰ جل شانہٗ کے بارے میں مجملاً صرف یہ علم ہو کہ وہ بڑی قدرت اور اختیار والا ہے۔ لیکن اس کے اقتدار و اختیار کے مکمل تصور سے نا آشنا ہو۔ اس کے دل میں کس طرح خوف پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے، خوفِ خدا کے تقاضے اہل علم یعنی علمائے امت اور اہل ایمان ہی پورے کر سکتے ہیں۔ خوف ہی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ ۝ (البقرہ۔۴۱) ”اور (کسی اور کے بجائے) صرف میرا خوف دل میں رکھو۔“

یہ آیت ہمیں صاف صاف بتا رہی ہے کہ دنیا میں ڈرنے کے لائق صرف خدائے واحد ہی ہے۔ مومن کے دل میں کبھی غیر اللہ کا خوف جاگزیں نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ سارے انسان اس کی طرح اللہ کے محتاج ہیں۔ اللہ کے سوا کسی میں نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں اور اللہ کے سوا کوئی حیات و موت کا مالک نہیں، نہ کوئی دے سکتا ہے، نہ کوئی محروم کر سکتا ہے اور یہی اختیارات ہیں جن کی بنا پر انسان کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری صفات اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں۔ پھر خوف و خشیت کی مستحق بھی اس کی ذات پاک ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں زور دے کر فرمایا گیا کہ مجھ ہی سے ڈرو۔

خوف الٰہی کا ایک بڑا تقاضا قلب کو ان خواہشوں سے محفوظ رکھنا ہے جو خلافِ حق ہیں۔ معاملات و عبادات کے تمام شعبوں میں احکام خداوندی اور سنت نبوی کا اتباع و خشیت کے نتائج ثمرات ہیں۔ ایمان کا تقاضا تو یہی ہے کہ مومن اپنے ہر قول و عمل کے سلسلے میں ہر وقت یہ خوف محسوس کرتا رہے کہ وہ اللہ کے حضور کیا جواب دے گا؟ اس طرح وہ اپنا احتساب خود کرتا ہے۔ خوف کا ایک مقام اور بھی ہے اور وہ اللہ کے خاص اور مقرب بندوں کیلئے ہے یعنی وہ اللہ سے ڈرتے ہیں کہ خطا و لغزش کی بنا پر کہیں وہ اس کی نظروں سے گر نہ جائیں۔ اور جو نعمتیں ملی ہیں وہ سلب نہ ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی ہر چیز اپنی جگہ پر نعمت کبریٰ ہے کہ یہ نعمت نہیں ہے کہ اس نے ہمیں ایمان کی دولت بخشی۔ کیا یہ نعمت نہیں کہ ہمیں خیر الامم قرار دیا۔ کیا یہ نعمت نہیں کہ ہماری ہدایت و رہبری کیلئے خاتم الانبیاء کو بھیجا کیا یہ نعمت نہیں کہ قرآن پاک ایک مکمل نظامِ زندگی بنا کر نازل فرمایا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اللہ کے ان احسانات کا شکر بھی ادا کرتے رہیں اور اس بات سے یہ خوف بھی محسوس کرتے رہیں کہ کہیں کسی گناہ کی وجہ سے یہ نعمتیں سلب نہ کر لی جائیں۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی بہت ضروری ہے کہ خوف کا زیادہ بڑھ جانا بھی قرآنی ہدایات کے خلاف ہے۔ اسلامی طرز زندگی وہ ہے جس میں امید و خوف دونوں جذبات و محرمات کی جھلکیاں موجود ہوں جس کی بہترین مثالیں اسوۂ صحابہ اور سیرت طیبہ میں ملتی ہیں۔

رحمتِ الٰہی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

لَاتَقْنَطُوْامِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ (الزمر۔۵۳)

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یقین جانو اللہ سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے: وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ؕ (الاعراف۔۱۵۶) "اور جہاں تک میری رحمت کا تعلق ہے، وہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔"

اسی طرح حدیث پاک میں بھی آتا ہے "اے میرے بندے! اگر تیرے گناہ زمین کی وسعتوں کو بھر دیں پھر تو مجھ سے توبہ کر لے، میں تجھے معاف کر دوں گا مجھے کسی کی پروا نہیں۔" (مشکوٰۃ) ایک دوسری روایت ہے کہ: "اگر کافر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی رحمت کی وسعت جان لیں تو اس کی رحمت سے کوئی ایک بھی مایوس نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

بڑے بڑے کبیرہ گناہوں پر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ یک لخت اپنی رحمت کا قلم پھیر دیتے ہیں، یعنی ان کو اس کے نامۂ اعمال سے مٹا دیتے ہیں اگر بندہ سچے دل سے توبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ غفور و رحیم ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے پچھلی امتوں کے ایک شخص کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شخص تھا جس نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا تھا، بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کیا تھا۔ جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے وصیت کی کہ میں نے اپنی زندگی گناہوں میں گزار دی، کوئی نیک کام نہیں کیا، جب میں مر جاؤں تو میری نعش (میت) کو جلا دینا اور جب جل کر راکھ بن جائے تو اس کو تیز ہواؤں میں اڑا دینا تاکہ وہ ذرات دور دور تک چلے جائیں۔ یہ وصیت میں اس لئے کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسا عذاب دیں گے کہ ایسا عذاب کسی اور کو نہیں دیا ہوگا۔ جب اس آدمی کا انتقال ہو گیا تو اس کے گھر والوں نے اس کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس کی نعش کو جلا دیا اور راکھ کو ہوا میں اڑا دیا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا، اس کے ذرات کو جمع کرو جب ذرات جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے حکم دیا کہ اس کو دوبارہ مکمل انسان جیسا تھا ویسا بنا دیا جائے۔ چنانچہ زندہ کر کے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے دربار میں پیش کیا گیا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس سے فرمایا تم نے یہ وصیت کیوں کی تھی؟ جواباً اس نے کہا یا اللہ! آپ کے خوف سے کیونکہ میں نے بہت سے گناہ کئے تھے اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ کے عذاب کا مستحق ہو گیا ہوں۔ میں نے آپ کے عذاب کے ڈر سے یہ وصیت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ فرمائیں گے جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔ (سبحان اللہ) یہ واقعہ خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا اور صحیح مسلم میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے۔ (صحیح مسلم کتاب التوبہ)

اس شخص کی وصیت بڑی غیر مناسب تھی کیونکہ وہ یہ سمجھا کہ جب مجھے راکھ بنا کر اڑا دیا جائے گا تو مجھے رب تعالیٰ کے سامنے حاضر نہ کیا جائے گا۔ اور یوں میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جاؤں گا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کو جوش آیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی، اس کی پکڑ نہ فرمائی۔ ہمیں اللہ رب العزت کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی رحمت نہایت وسیع ہے۔ اگر 100 سالہ بوڑھا شخص جس کی عمر گناہوں میں، عیاشیوں میں گزری ہو، خلوصِ دل کے ساتھ اپنے گناہوں پر نادم ہوتے ہوئے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی معاف فرما دیتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہم سب کو سچے دل سے گناہوں سے توبہ کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

(الف) اللہ کے مقبول بندے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ط (المائدہ۔۱۱۹) ''اللہ ان سے خوش ہے اور یہ اُس سے خوش ہیں۔''

یعنی اللہ ان سے راضی ہے جیسے الفاظ سے ان کی عزت افزائی فرماتا ہے، مالک ان سے خوش تھا اور خالق ان سے راضی تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے جذبۂ جانثاری کو اس طرح قبول فرمایا کہ وہ نہ صرف اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کے یہ بندے ایسے محبوب و مقبول ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی ذرہ نوازی سے خود بھی راضی اور خوش ہیں۔ بندے کی رضا کا اس طرح ذکر ان کے عجیب و غریب مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سب سے زیادہ مقبول و محبوب رہے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کی شان میں فرمایا کہ میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ تم ان میں سے جس کسی کی بھی پیروی کرو، راہِ حق پر رہو گے۔

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے بلاشبہ وہ لوگ ہیں جو اس کے احکام کی بالکل اسی طرح اطاعت کرتے ہیں، جس طرح رسول اللہ! ﷺ نے بتایا اور عمل کر کے دکھایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے اور جن لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھا اور اپنی بساط کے مطابق آپ ﷺ کی پیروی کی وہی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، اہل بیت، ازواج مطہرات اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جن کے اوصاف حمیدہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے قرآن کریم میں بیان فرمائے ہیں:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ کہیں فرمایا: اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ کہیں فرمایا: اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ کہیں فرمایا: وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ ۔

اللہ کو اس لئے محبوب تھے کہ وہ صرف نمازیں ہی نہیں پڑھتے تھے، بلکہ نماز کی روح سے بھی آشنا تھے۔ اس لئے تن من دھن سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اور ان کی عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ ہر قسم کی قربانی بغیر کسی پس و پیش اور جبر و اکراہ کے پیش کرتے تھے۔ ان کی ارادت و اطاعت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی آنحضرت ﷺ ان سے کوئی بات دریافت فرماتے تو جانتے ہوئے بھی پاسِ ادب سے یہی فرماتے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ ان میں اولیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل تھی۔ قبول اسلام کے بعد وہ اسلام کی تبلیغ میں آنحضرت ﷺ کے دستِ راست بن گئے۔ اور جو کچھ ان کے پاس تھا، راہِ خدا میں سب نثار کر دیا اور میدانِ جانثاری میں کوئی دوسرا صحابی رضی اللہ عنہ آپ سے بازی نہ لے جا سکا۔ بعض مواقع پر گھر کا سارا اثاثہ اللہ کی راہ میں دے دیا اور جب آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اہل و عیال کیلئے بھی کچھ چھوڑا ہے، تو عرض کیا کہ ان کیلئے اللہ اور اس کے رسول کافی ہیں۔ یہ ہیں اللہ کے مقبول بندوں کی نشانیاں جن کی تعریف خود رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر فرمائی کہ سب کے احسان کا بدلہ ہم نے ادا کیا، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے احسان کا بدلہ خود اللہ تعالیٰ ادا کرے گا۔

(ب) اللہ کے مقبول بندے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (آل عمران۔۳۱)

یعنی" (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خاطر تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔"

اس واضح حکم سے یہ بات صاف ہوگئی کہ اللہ کے نیک بندے اور مقبول بندے، اور محبوب بندے صرف وہی ہیں جو اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت اور پیروی کرتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ اللہ کے مقبول و محبوب بندوں کے زمرے میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں چاہیئے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا گہری نگاہ سے مطالعہ کریں اور اس پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اپنی عبادت، اپنے اخلاق، اپنے مزاج، اپنے طور طریقے، ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی اور محبت سب کچھ رسول اللہ ﷺ کے نمونے پر پورا اتارنے کی کوشش کریں۔ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر جتنا زیادہ عمل کرے گا وہ اتنا ہی زیادہ اللہ کا مقبول بندہ ہوگا۔

غرض اللہ کے مقبول بندے وہی ہیں کہ جو اللہ کے ہر حکم کی بغیر کسی پس و پیش کے اطاعت کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے ہر فیصلے کو اس طرح تسلیم کرتے ہیں کہ دل میں ذرا بھی انقباض نہیں ہوتا۔ ان کیلئے محض یہ بات کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا یا فلاں معاملہ میں رسول اللہ ﷺ نے اس طرح عمل کیا۔ یہ اتباع سنت ہے اور اہل اسلام کیلئے اس کا بلند و اہم مقام ہے، اس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں عام طریقہ یہ تھا کہ ہر معاملے میں قرآن حکیم سے رجوع کیا جاتا اور اگر وضاحت نہ ملتی تو رسول اللہ ﷺ کا اسوہ دیکھا جاتا۔ اپنی رائے صرف اس وقت کام میں لائی جاتی جب قرآن و سنت میں کوئی فیصلہ نظر نہیں آتا۔

کیونکہ ایسا انسان ہی ہے جو قرآن کی تعلیمات تو تسلیم کرتا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سنتِ رسول ﷺ کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے، وہ بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ کا مقبول و محبوب بندہ ہے اور ایسا انسان فکر و عمل کے لحاظ سے، طرزِ زندگی کے اعتبار سے، اپنے مسلک و سلوک کی وجہ سے ہمیشہ سربلند رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے نیک اعمال کی وجہ سے اسے سرفرازی عطا فرماتا ہے۔ سچا اور صادق مسلمان ہمیشہ سرخرو ہوتا رہتا ہے۔ دین فطرت ہونے کی وجہ سے اسلام نے اپنی برتری کو ساری دنیا سے تسلیم کرالیا ہے۔ قرآن حکیم نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔(آل عمران،۱۹)

یعنی: "بیشک (معتبر) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔"

آیئے! ہم اہلِ پاکستان و اہلِ اسلام غور کریں کہ ہم خود اپنی سربلندی کیلئے کیا راستہ اختیار کریں اور اپنی سرفرازی کا کیا سامان کریں۔ راہ صاف ہے، روشنی موجود ہے۔ ہماری وقعت و عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ ہم سچے مسلمان بنیں اور اپنی زندگیوں کو اسلام کے قالب میں ڈھالیں۔ پاکستان و اہل اسلام کی عظمت کا راز بھی اسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں اور ہم اللہ تعالیٰ کے نیک و محبوب اور مقبول بندوں میں داخل ہوں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان وعظمت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (المجادلہ۔۲۲)

"یہ اللہ کا گروہ ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔"

خالق کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا فرمایا۔ پھر انسانوں میں بھی مراتب قائم فرمائے۔ انسانیت کا سب سے اونچا طبقہ انبیاء کرام علیہم السلام کا پیدا فرمایا۔ اس میں بھی مراتب قائم فرمائے، لیکن سرداری کا تاج، امام الانبیاء ختم الرسل، سید الاولین والآخرین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے سر پر رکھ دیا۔ پھر ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے متبعین (پیروکاروں) کی ایک جماعت عطا فرمائی۔ لیکن جو جماعت اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے ہمارے پیغمبر ﷺ کو عطا فرمائی، وہ جماعت کسی اور پیغمبر کو نہیں ملی۔ اس جماعت کو "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین" کی جماعت کہا جاتا ہے۔

صحابی کا معنیٰ ہے "ساتھی" صحابی اس شخص کو کہتے ہیں کہ "جس کو ایمان کی حالت میں نبی علیہ السلام کی صحبت حاصل ہوئی اور ایمان کی حالت ہی میں ان کا انتقال ہوا ہو۔" صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ یہ وہ مبارک شخصیات ہیں جنہوں نے نبی کریم علیہ السلام سے براہِ راست فیض حاصل کیا۔ جن کو آپ علیہ السلام کی صحبت میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، جو آپ علیہ السلام کی زندگی کا نمونہ ہے۔ جن کی زندگیوں میں پیغمبر کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔

تیرے غلاموں میں بھی نمایاں جو تیرا عکس کرم نہ ہوتا ۔۔۔ تو بارگاہِ ازل سے تیرا خطاب خیرا لامم نہ ہوتا

یہ عاشقوں کی وہ جماعت ہے جنہوں نے اپنی ہر مراد کو پیغمبر کی ادا پر قربان کر دیا تھا، اپنی خواہشات کو پیغمبر کی خواہشات پر قربان کر دیا تھا۔ جنہوں نے پیغمبر علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہر فرمان پر عمل کر کے دکھلایا۔ محبت کا یہ عالم کہ پانی کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے بدن پر لگانا سعادت سمجھا۔ وہ جانثاروں کی جماعت جنہوں نے پیغمبر علیہ السلام کو تنہا نہیں چھوڑا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر اپنے کنبے اور قبیلے کو چھوڑنا تو گوارا کیا لیکن اسلام کے اور پیغمبر علیہ السلام کے دامن کو چھوڑنا کسی طرح گوارا نہ کیا۔ جو ظلم وتشدد کے دور میں بھی توحید کی صدائیں بلند کرتے رہے، جنہیں پیغمبر کے دامن کے ساتھ وابستگی کی پاداش میں کوئلوں اور انگاروں پر لٹایا گیا۔ جس کی وجہ سے ان کے جسم کی چربی جل گئی جنہوں نے اپنے مقدس خون سے اسلام کے شجر کی آبیاری کی۔ اس لئے کسی شاعر نے کہا ہے:

اسلام وہ شجر نہیں جس نے پانی سے غذا پائی ۔۔۔ دیا خون صحابہؓ نے تو اس میں بہار آئی

اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ساڑھے سات سو (750) مرتبہ صحابہ کی شان بیان کی جن کو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے دنیا میں رضا کا پروانہ عطا فرمایا۔ جنہیں پیغمبر علیہ السلام نے اپنی زبان مبارک سے ہدایت کے روشن چراغ اور معیارِ حق قرار دیا۔

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ ۔ (مشکوٰۃ)

"میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔" جن کی عظمت کو حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اتنا اونچا کر دیا کہ ساری کائنات کے ولی، قطب، غوث مل کر بھی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتے۔ جن کو حق تعالیٰ نے اللہ کی جماعت جیسے مقدس القاب سے نوازا۔ آیئے! ہم بھی ان مقدس شخصیات کی زندگیوں کا مطالعہ کر کے ان جیسی صفات پیدا کریں تاکہ ہمیں بھی دنیا وآخرت دونوں کی فلاح وکامیابی نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دیں۔ آمین

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ لا رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

(سورۃ التوبہ۔۱۰۰) ''اور مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ پہلے ایمان لائے، اور جنہوں نے نیکی کے ساتھ اُن کی پیروی کی ، اللہ اُن سب سے راضی ہو گیا ہے، اور وہ اُس سے راضی ہیں۔''

اس بات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اولیاء اللہ کے سردار، اہلِ تقویٰ کے چیدہ و برگزیدہ اور اہلِ ایمان کیلئے مقتدا و نمونہ ہیں۔ وہ انبیائے مرسلین علیہم السلام کے بعد دنیا میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سب سے بہترین بندے ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے علم دین کو حاصل کیا، خوشی اور غمی غرض ہر موقع پر نبی کریم ﷺ کی رفاقت سے فیض یاب ہوئے۔ یہ وہی تھے جنہوں نے دین کے محلات قائم کئے، شرک و کفر کی جڑیں کاٹ کر دین اسلام کا نور، اس آباد دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا۔ نبی کریم ﷺ کی رفاقت اور اپنے ان مقبول اعمال کی وجہ سے وہ ''خیر القرون'' کہلائے۔ ان شخصیات کا ظہور کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کو مشیتِ الٰہی اور ارادۂ خداوندی نے ازل سے طے کر رکھا تھا۔ انبیاء علیہم السلام اس جماعت کیلئے دعائیں کرتے رہے تھے اور کتب سابقہ بشارتیں دیتی رہیں تھیں۔ اپنی جان، مال، عزت و آبرو ہر چیز اسلام پر خرچ کر کے ان نفوسِ قدسیہ نے اسلام کی خدمت اور نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے والے دین کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچایا۔ آج سکھر کے قریب محبوب گوٹھ میں حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی قبریں، پشاور میں اصحاب بابا کے نام سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی 45 قبریں، افغانستان اور دنیا کے دیگر گوشوں میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مبارک قبور اس بات کی گواہی دے رہی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ اور امت کے درمیان واسطہ ہیں، ایک پل ہیں۔ اگر اس پل کو توڑ دیا جائے، اس واسطے کو نکال دیا جائے تو امت محمدیہ دھڑام سے نیچے گر جائے۔ پھر اصل اسلام باقی رہتا ہے نہ قرآن۔ موجودہ دور میں ان نفوسِ قدسیہ کی شخصیت مجروح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ آج احترامِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عقیدہ کو چیلنج کیا جارہا ہے معاذ اللہ! کہیں تکفیر کا دروازہ کھلا ہے تو کہیں تنقید کو جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ان نفوسِ قدسیہ کی حفاظت کیلئے بھرپور اقدامات کئے جاتے۔ مگر افسوس کہ اس عنوان پر کوئی خاطر خواہ کام نہ کیا جاسکا۔ گستاخانِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق تکفیر کا فتویٰ 1988ء میں مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ نے اپنے مؤقر جریدہ ماہنامہ الفاروق میں شائع کیا جس پر بہت سے جید علمائے کرام کے دستخط ثبت تھے، پھر یہی فتویٰ مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ نے ماہنامہ بینات اور مفتی جمیل خان شہید رحمہ اللہ نے اقرأ اگست میں بھی شائع فرمایا، اور اب 11 اکتوبر کے روزنامہ اسلام کے صفحہ اول پر چھپنے والی ایک اہم خبر جس کی سرخی کچھ یوں ہے۔ ''سعودی علماء کی سپریم کونسل نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گستاخ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا ہے۔'' مگر یہ سب محنت علمائے امت کی ذاتی محنت تھی اس پر حکومت کو کوئی دلچسپی نہ تھی، بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شاید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تحفظِ ناموسِ صحابہ کی جدوجہد کرنے والوں کے ہی کچھ لگتے ہیں، کسی اور کا ان شخصیات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ آج سعودی عرب کی حکومت کے زیرِ اہتمام علمائے کرام کی سپریم کونسل کا گستاخِ صحابہ کے متعلق یہ متفقہ فتویٰ شہدائے ناموسِ صحابہ کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ پاکستانی حکومت کو بھی چاہیئے کہ گستاخی صحابہ کے عنوان پر قانون سازی کر کے گستاخان صحابہ کو قانونی شکنجے کے ذریعے ان کو اپنے انجام تک پہنچائے۔

دیگر ممالک کی طرح گستاخانِ صحابہ کی ایک بڑی تعداد پاکستان میں بھی پائی جاتی ہے جو عاشورہ محرم اور دیگر مواقع پر ہونیوالی مجالسِ عزا میں صحابہ کرام پر تنقید کرتی ہے۔ توہین آمیز لٹریچر شائع کیا جاتا ہے اور اسے عام کیا جاتا ہے۔ اسی گستاخی کی بنیاد پر پاکستان میں سنی شیعہ فسادات بھی ہوتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان فسادات کے نتیجے میں بیس ہزار سے زائد افراد قتل ہو چکے ہیں۔ سعودی علماء کے اس فتویٰ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر پاکستانی حکام قانون سازی کریں اور گستاخِ صحابہ کو بلا امتیاز دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہوئے کیفرِ کردار تک پہنچائیں تو یہ قتل و غارت کا سلسلہ رک سکتا ہے۔ اور پاکستان امن و امان کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

خودی اور عبدیت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ (الاعراف۔۱۷۹)

"اُن کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، اُن کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اور اُن کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔"

محنت وکاوش کے بغیر لقمہ حلق سے اتارنا روحِ اسلامی کے سراسر منافی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اور دوسروں کی امدادوں پر جینا شعائرِ اسلامی کے قطعاً خلاف ہے۔ اس سے انفرادی واجتماعی خودی پامال ہو کر رہ جاتی ہے۔

خودی اور عبدیت اگر آپ احتیاط اور گہرائی کے ساتھ غور فرمائیں تو یہ محض دو الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ بنیادی اصطلاحات ہیں کہ جو ایک خاص طرزِ زندگی اور رمزِ حیات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ خودی کی اصطلاح کتنی ہی غامض وسیع اور فلسفیانہ کیوں نہ ہو اس کا مرکز اور محور بہر حال عرفان نفس ہے۔ اسی مقام پر پہنچ کر ہمارا ذہن اس ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جس سے ہماری تخلیق کا رشتہ وابستہ اور قائم ہے اور اسی رشتے کے احساس کامل اور ادراک عمیق وبلیغ کا اصطلاحی نام عبدیت ہے۔ لہٰذا جہاں خودی ہے وہاں عبدیت ہے۔

حقیقی عبدیت احکامِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت اور غیر اللہ کی حاکمیت تسلیم کرنے سے انکار کا نام ہے۔ جو شخص خدائے واحد کو اپنا خالق، رازق اور معبود حقیقی تصور کرتا ہے وہ درحقیقت سارے خداوندان باطل کی خدائی سے انکار کرتا ہے۔ یہ عبد کامل (ﷺ) کی خودی ہی تھی کہ آپ ﷺ عبدیت کاملہ کے ساتھ ساری دنیا اور اس کی خدائی کے جھوٹے دعویداروں سے بے نیازی اختیار فرمائی۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے صرف انہیں کو نہیں بلکہ شش جہات کو آپ کیلئے مسخر کر دیا۔

تسخیر کا یہ وعدہ ہر اس شخص کیلئے ہے جو خودی اور عبدیت کی راہوں پر گامزن ہو، مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہم آج ایسے دور سے گذر رہے ہیں کہ اس میں نہ احساسِ خودی ہے اور نہ شعورِ عبدیت۔ قرآن حکیم نے ہمارے لئے جس روشنی کا انتظام کیا تھا اور سنتِ رسول نے ہمیں جو ہدایات بخشی تھیں، ان سے ہمارے فکر ونظر اور سعی وعمل کا دامن خالی ہو چکا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہم سے قوموں کی امانت وقیادت کا منصب چھن چکا ہے۔ اور ہم خود رسوا ہو کر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اپنی انفرادی خودی سے محروم ہو کر ہمارا مقدر یہ بنا ہے کہ ہم نے اپنے نظریۂ حیات ملی کو گم کر دیا ہے۔

مسلمانانِ عالم عبدیت کے معانی ومفاہیم کا لفظاً ومعناً احساس وادراک کریں اور اپنی زندگی اور زندگی کے ہر شعبے میں عملاً اس کا مظاہرہ کریں۔ خودی کا مفہوم صرف اسی حالت میں ہماری سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ ایک مسلمان کیلئے خودی اور عبدیت لازم وملزوم ہیں۔ عبدیت ہی اس کی خودی ہے اور یہی وہ خودی ہے کہ جس نے مسلمان کو شرف اور امتیاز بخشا ہے اور یہی وہ خودی ہے کہ جس سے اہلِ اسلام اقوام وملل عالم میں امتیاز وتشخص حاصل کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنی فکر ونظر کو وسعت دیں اور اپنے اخلاق وکردار کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر ان کی بلندیوں کی طرف متوجہ ہوں۔ اپنے دل ودماغ کو ٹٹولیں اور اگر حواس ظاہر وباطن یہ گواہی دیں کہ ہم خودی مٹا چکے ہیں تو پھر اب بھی وقت ہے کہ ہم سلامت روی اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں۔ آمین

اللہ سے سرکشی کا انجام

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ۔۲۱۶)

یعنی: ”اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو اور (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اللہ جو قادرِ مطلق ہے۔ احکم الحاکمین ہے، انسان کو محض حکم ہی نہیں دیتا بلکہ اس کو اس بات کا یقین بھی دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے میں تمہاری بھلائی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی کسی بات کا حکم دیا گیا ہے یا کسی بات سے روکا گیا ہے، اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے محض قانون کی زبان میں یہ بات نہیں کہی، بلکہ ایک رحیم و کریم آقا کی طرح، ایک واقفِ حال مربی کے انداز میں اور اپنے بندوں اور اپنی مخلوق پر رحم کرنے والے اور شفقت کا برتاؤ کرنے والے رب کی حیثیت سے کہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بار بار اور بہ تکرار یہ فرماتا ہے کہ اللہ تمہیں جن باتوں کا حکم دیتا ہے ان پر عمل کرنے میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔ انتہائی محبت اور پیار کے الفاظ میں بندوں کو سمجھاتا ہے کہ اپنی بھلائی کی خاطر اللہ کا حکم مان لو، پھر اپنی اطاعت پر اجرِ عظیم کا وعدہ فرماتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بندہ میرا قرب حاصل کرنے کیلئے اور میری اطاعت و فرمانبرداری کی راہ میں میری طرف بالشت بھر آگے بڑھتا ہے، میں اس کی طرف ہاتھ بھر بڑھتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہے میں گز بھر اس کی جانب بڑھتا ہے۔ اگر میرا بندہ چلتا ہوا میری طرف آئے تو میں دوڑتا ہوا اس کی جانب بڑھتا ہوں۔“

اب آپ سوچئے کہ ایسے مہربان آقا کا حکم ماننے اور خوشدلی سے تسلیم کرنے کی بجائے جو بدنصیب اور جو بدقسمت اس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ کس انجام کے مستحق ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی نافرمانی کرنے والوں کو ان کے برے انجام سے بار بار ڈرایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖٓ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (النور۔۶۳)

یعنی ”لہٰذا جو لوگ اُس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اُن کو اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ کہیں اُن پر کوئی آفت نہ آپڑے، یا اُنہیں کوئی دردناک عذاب نہ آ پکڑے۔“

آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی کوئی تنبیہہ ہے، تفہیم کے انداز میں ہے، سمجھانے کے پیرائے میں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کو سرکش، ناشکری اور بغاوت کی راہ اختیار کرنے والے بندوں کی تباہی بھی مقصود نہیں وہ انہیں بھی اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دینے کو تیار ہے۔ مگر ہم ہیں کہ اپنے انجام سے بے خبر، اللہ کی پکڑ سے بے نیاز، اس کی رحمت سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اللہ کی رحمت کا دامن جس قدر وسیع ہے اس کے عفو و درگذر کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس کی رحمت سے مایوس ہو جانے والوں سے بھی ناراضگی کا اظہار فرماتا ہے: وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَۃِ رَبِّہٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۝ (الحجر۔۵۶) ”اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہوں کے سوا کون نا اُمید ہو سکتا ہے؟“

اللہ کو بھلا دینا

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ ؕ (الحشر۔۱۹) ”جو اللہ کو بھول بیٹھے تھے، تو اللہ نے اُنہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔“

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو بھلا دینا کرۂ ارض یعنی اس دنیا کا سب سے بڑا حادثہ اور سب سے الم ناک سانحہ ہے۔ تاریخ کے صفحات، عظیم تغیرات اور کثیر واقعات انسان کی اس بدقسمتی کی گواہ ہیں اور شاہد ہیں کہ انسان نے خود فراموشی کی راہ اختیار کی اور اپنی حقیقت سے صرفِ نظر کیا۔ خود فراموشی اور اپنی حقیقت کی فہم سے فرار انسان کا سب سے بڑا گناہ ہے کیونکہ اس کے ارتکاب ہی سے اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے کی راہ کھلتی ہے۔ انسان جب اپنی حقیقت کو فراموش کر کے اللہ تعالیٰ کو بھلاتا اور فراموش کرتا ہے تو درحقیقت وہ ایک عذاب کا شکار اور ایک مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرے میں فساد اور سوسائٹی میں انتشار اور دل و دماغ میں افکار بد کی یلغار اور فکر و عمل میں تضاد صرف اسی حالت میں پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھول گیا۔ اپنے آپ کو بھول جانا قرآن حکیم کے مطابق اللہ کو بھلا دینے کی سزا ہے۔

بلاشبہ سزاؤں میں یہ بڑی سزا ہے کہ انسان اپنی حقیقت سے محروم ہو جائے۔ انسان کی حقیقت ہے کیا؟ طبیعاتی نقطۂ نظر سے انسان خاک و آب کا ایک متحرک ڈھیر ہے جو اگر اپنے مقام کو پہچانے تو اس عالم آب و گل میں خلاقِ عالم اور مالکِ کل کا نائب اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے اس مقام اور اپنی اس عظمت و رفعت کو، کہ جو اسے اللہ کے نائب کی حیثیت سے حاصل ہے، حسنِ اطاعت اور حسنِ سلوک و عمل کے ذریعہ سے باقی نہ رکھ سکے تو قرآن حکیم کے الفاظ میں وہ جانور بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ (الاعراف۔۱۷۹)

انسان کی عظمت اور اس کی بلندی و رفعت اور انسان کی بے حیثیتی اور بے وقعتی کے درمیان وجہ فرق اور باعث امتیاز بننے والی خصوصیت اللہ کی پہچان اور اللہ کی یاد ہے اور ایمان ہے جس کے ساتھ عمل صالح ہو۔ اگر ہمارے اعمال صالح نہیں اور نیک نہیں، اگر ہم نے دیانت و امانت کو ترک کر دیا ہے، اگر ہم انسان کے مقامِ شرف کا احترام نہیں کرتے ہیں اور ایذا رسانی کرتے ہیں، انسانوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اور اگر ہم ارکانِ اسلام سے صرفِ نظر کرتے ہیں یعنی نمازیں چھوڑتے ہیں، روزے سے غفلت برتتے ہیں، زکوٰۃ سے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں وغیرہ تو یہ یقیناً اللہ کو بھول جانا ہے اور یہ یقیناً صراطِ مستقیم اور سیدھی راہ نہیں ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حق تعالیٰ کا ذکر ہر لحہ اور ہر وقت کرتے تھے اور ہمیشہ یادِ الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اور کوئی چیز آپ ﷺ کو ذکرِ الٰہی سے باز نہ رکھتی تھی، اور آپ ﷺ کی ہر بات یادِ حق، حمد و ثنا، توحید و تمجید، تسبیح و تقدس اور تکبیر و تہلیل میں ہوتی تھی اور حضور ﷺ کا ہر سانس، آپ کے قلب و زبان اور آپ کا اٹھنا بیٹھنا، کھڑا ہونا لیٹنا، کھانا پینا، آنا جانا، سفر و اقامت غرض کہ کسی حال میں بھی ذکرِ حق سے جدا نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے کی یہ معراج ہے، اور درحقیقت یہ نمونۂ عمل ہے کہ جو امت مسلمہ کیلئے مشعل راہ ہے۔ اور یہ ہدایت ہے کہ جو ہادی برحق ﷺ نے مسلمانوں کو اپنے عمل سے دی ہے۔

علم حاصل کرنے کی فضیلت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۝ (سورۃ العلق۔ ۱ تا ۵)

یعنی: ”پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا، (۱) اُس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے (۲) پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، (۳) جس نے قلم سے تعلیم دی، (۴) انسان کو اُس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا۔“

یہ پہلا سبق ہے جو اللہ تعالیٰ نے علم کی افادیت و اہمیت کے متعلق دیا۔ اسلام سے پہلے علم ایک مخصوص طبقے کی میراث سمجھا جاتا تھا اور عام انسان کیلئے نہ اس کی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور نہ علم تک اس کی پہنچ تھی۔ اسلام ہی وہ پہلا دین ہے جس نے علم کی ضرورت پر زور دے کر عام انسانوں تک علم پہنچایا۔ اور ایک مخصوص طبقے سے نکال کر اس دولت کو عام کیا اور اس کی روشنی کو پھیلایا۔ اسلام میں علم کی فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ خالق کائنات نے اپنے صاحب علم ہونے کا بطور خاص اور متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ جس کے ذریعے سے اس نے خود کو بندوں سے متعارف کرایا۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر علیم کا ذکر قرآن حکیم میں تقریباً ایک سو پچاس مقامات پر آیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ محض علیم ہی نہیں معلم بھی ہیں۔

ان ہی قرآنی تعلیمات کا ثمر تھا مسلمانوں نے تعلیم کو، علم کے حصول کو، علم کی اشاعت کو اہمیت دی اور عالم کی عظمت کو، صاحبِ علم کی عزت کو، علم دوست کی وقعت کو بڑھایا، اس میں اضافہ کیا۔ اتنا اضافہ کیا کہ مسلمان اس معاملے میں تمام دنیا سے بڑھ گئے اور علم کی روشنی میں ان کا کوئی مقابل نہ رہا۔ اخلاق و کردار کے بعد علم کو اپنے لئے باعث و شرف ذریعۂ مجد، اور وجہ فضیلت جانا۔ علم حاصل کرنے، علم کو پھیلانے، علم کی قدر و توقیر کرنے کے واقعات مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا حصہ ہیں۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”علم حاصل کرو اس لئے کہ جو شخص علم حاصل کرتا ہے وہ اللہ کے راستے میں نیکی کرتا ہے۔ جو شخص علم کا تذکرہ کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے۔ جو شخص علم کی جستجو کرتا ہے، وہ اللہ کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ جو شخص علم کو پھیلاتا ہے وہ صدقہ دیتا ہے۔ (مسلم و ترمذی)

ایک اور ارشاد ہے: ”طالب علم کی راہ میں فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں۔“

حضور ﷺ نے علم کو عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔ فرمایا: ”عالموں کی باتوں کو سننا اور حکمت کے اسباب کو دوستوں کے ذہن نشین کرانا عبادت سے بڑھ کر ہے۔“ (مسلم)

اور یہ بھی سرکارِ دو عالم ﷺ ہی کا ارشاد ہے کہ طالب علم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے بھی زیادہ پاک ہوتی ہے۔ (مسلم)

میں نے قرآن و حدیث کے بحرِ زخار میں سے صرف چند ارشادات پیش کئے ہیں جن سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام میں علم حاصل کرنے کی فضیلت پر کس قدر زور دیا گیا ہے اور عالم اور طالب علم کی عظمت و رفعت ہمارے دینِ اسلام میں کتنی زیادہ ہے۔

تعلیم کا مقصد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ ۙ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ (المجادلہ۔۱۱)

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، اللہ ان کو درجوں میں بلند کرے گا۔"

اس آیت کریمہ سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ایمان و علم کو یکساں درجہ حاصل ہے۔

علم کی اہمیت اور عظمت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ وہ صفت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے سلسلے میں بطور خاص ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت اور علم لازم و ملزوم ہیں۔ نبوت کے منصب سے تین امور بطور خاص متعلق ہیں۔ لوگوں کو غیر اللہ کی بندگی اور شرک کی ذلت سے نجات دلانا فکری اور عملی حیثیت سے نفوس کا تزکیہ کرنا اور ان میں اعلیٰ اخلاقی صفات پیدا کرنا اور یہی مقاصد علم کے بھی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں علم کو انبیاء کا ورثہ قرار دیا ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کیلئے علم کی جو اہمیت ہے اس کے پیش نظر ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو ایسے خطوط پر استوار کریں کہ اس سے استفادہ کرنے والی نسل انبیائے کرام کے اس ورثے کی حفاظت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو سکے۔ بنیادی طور پر ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصد اور منشا یہی ہونا چاہیئے۔

ہمارا آج کا نظامِ تعلیم ہمارے ملی اور دینی مقاصد سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مسلمان حکومتیں تعلیم کی مد میں کثیر رقمیں خرچ کرنے کے باوجود ایسے نوجوان پیش کرنے سے قاصر ہیں جن کے سینے آتش ایمان سے دہکتے ہوں اور وہ آج اس مادیت پرست دور کی قوتوں سے آنکھیں بھی چار کر سکتے ہوں۔ افسوس ہے کہ آج عالمِ اسلام میں مکتب اور مدرسے، کالج اور یونیورسٹیاں، تحقیقی ادارے اور کتب خانے سب کچھ موجود ہیں لیکن ان سے باہر آنے والے قدم دریاؤں کے دل دہلانے والی طوفانی قوت سے خالی ہیں۔ نظامِ تعلیم کے نقائص سے آج ہم نے اپنی انفرادیت کھو دی ہے۔ اپنا تشخص ضائع کر دیا ہے، اپنا تشخص کھو کر اپنا تاریخی مقام بھی کھو دیا ہے۔ جو ہمارے اسلاف نے بڑی قربانی دے کر حاصل کیا تھا۔ جب ہمیں یہ مقام حاصل تھا، ہم بحیثیت معاشرہ، بحیثیت فرد اپنے فرائض منصبی کی تکمیل کر رہے تھے۔ خود کو اپنے افکار و اعمال، اپنے اخلاق و کردار اور اپنی طرزِ زندگی کے ذریعے علوم انبیاء کا وارث بنا کر دنیا کے آگے پیش کر رہے تھے۔ اور تمام عالم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے پر مامور تھے۔ اور اللہ نے ہمارے سپرد جو امانت اس غرض سے کی تھی کہ ہم اس کا حق ادا کریں، ہم نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی۔ ہم نے اپنے اسلاف کا ورثہ گم کر دیا اور اپنی نوخیز نسلوں کو مادہ پرست، دنیا پرست تہذیب کے نام لیواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ہم اپنے بدخواہوں کی تقلید میں تعلیم برائے معاش جیسے نظریات کو اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ خود اپنے ہی کرتوتوں کے سبب منصب امامت و قیادت سے اتر کر عبرت کا نمونہ بن گئے۔ اگر ہم اپنے گذشتہ باعزت مقام پر واپس آنا چاہتے ہیں تو ہمیں مادہ پرست تہذیب کی تقلید کا چولا اپنے کاندھوں سے اتارنا ہوگا اور کتاب و سنت کی رہنمائی اور روشنی میں اپنی زندگی کی راہوں اور اپنے نظامِ زندگی کا نقشہ خود مرتب کرنا ہوگا۔ پھر وہ رفعت اور وہ عظمت جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنے اہلِ ایمان بندوں کیلئے مقدر کی ہے، ہم اس کے حق دار بن سکیں گے۔ اللہ ہماری رہنمائی فرمائے اور ہماری مدد کرے۔ (آمین)

دین میں تحصیلِ علم کی اہمیت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ۔۱۱۴) ”میرے پروردگار! مجھے علم میں اور ترقی عطا فرما۔“

دینِ اسلام میں علم کی اہمیت ایسی ہے جیسی اندھیرے میں روشنی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ کرۂ ارض کا یہ آخری مکمل واحد دین ہے جس نے مذہب کی بنیاد علم پر رکھی ہے اور بار بار لوگوں کو تحصیل علم اور کائنات پر غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ حضور ﷺ کی یہ حدیث شریف خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔“

سورۂ حج میں مسلمانوں کے متعلق فرمایا کہ: ”یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کو جب ہم اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف تبلیغ دین مسلمانوں کے فرائض میں شامل ہے بلکہ دین کے احکام کو نافذ کرنا بھی خیر الامم کی حیثیت میں ان کی ذمہ داری ہے۔ یہ فرض اور ذمہ داری وہی لوگ پوری کر سکتے ہیں کہ جو علم کے زیور سے آراستہ ہوں۔ اللہ کے احکام کو سمجھتے ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہوں اور ”تفقہ فی الدین“ یعنی علم میں ایسے مرتبہ پر فائز ہوں کہ نیک وبد میں امتیاز کر سکیں۔

آنحضرت ﷺ اشاعت علم کا اتنا زیادہ اہتمام فرماتے تھے کہ جب بدر کے بعض قیدی نقد فدیہ ادا نہ کر سکے تو آپ نے فرمایا دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو یہی تمہارا فدیہ ہے۔“

چنانچہ سورۂ توبہ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینہ) نہیں آسکتے، اس لئے کہ ہر قبیلے سے ایک گروہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ دین کی سوجھ بوجھ اپنے اندر پیدا کر سکیں۔ واپس جا کر اپنی قوم کو بے علمی کے وبال سے ڈرائیں کہ یہ لوگ اس طرح بری باتوں سے بچیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے علم کو بطور خاص بنیادی اہمیت عطا فرمائی۔ مگر عملی طور پر ہر ایک کیلئے دین کے معاملات میں مہارت حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے ہدایت فرمائی کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو دین کے اوامر ونواہی سے واقف ہو اور ”تفقہ فی الدین“ کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینِ اسلام کی بنیاد علم پر ہے۔ ایسا علم جو قرآن وحدیث کے ساتھ تمام دوسرے علوم پر بھی حاوی ہو۔ قرآن حکیم کا مطالعہ کیا جائے تو بار بار ایسی آیتیں سامنے آئیں گی جن میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے کائنات کے غور وفکر کی تاکید کی ہے۔ کہیں فرمایا: تم عقل سے کیوں نہیں کام لیتے۔ کہیں ناسمجھی اور بے عملی کے نقصانات پر آگاہ کیا اور فرمایا کائنات پر غور وفکر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوں۔ ایک جگہ ارشاد ہے: جاہل اور ان پڑھ کیا سوچے گا اور کیا سمجھے گا؟ ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: باپ کا اپنے بچے کو ادب سکھانا بہترین نیکی ہے۔ اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا کہ کوئی اپنے بچے کو اس سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم سے مراد وہ دینی تعلیم ہے جو انسان کو راسخ العقیدہ مسلمان بننے میں مدد کرے اس کے اخلاق سنوارے اور اس کے ساتھ ہی اس میں کائنات کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کی صلاحیت بھی پیدا کرے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں دولت علم سے مالا مال فرمائیں۔ (آمین)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ (الزمر۔۹)

"کیا وہ جو جانتے ہیں، اور جو نہیں جانتے، سب برابر ہیں؟"

اسلام نے علم اور اہلِ علم کو جو اہمیت دی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے علم اور جہل کے درمیان خطِ حاصل کھینچ کر صاف لفظوں میں اس آیت کریمہ میں بتا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اوہام و خرافات کے شکنجوں میں اسیر ہو کر کراہنے والی دنیا کو، نفس و روح کے کرب اور زندگی کی ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لانے والی کتاب قرآن مجید میں ہے جس کے بارے میں پروردگارِ عالم نے ارشاد فرمایا کہ اس کے ذریعہ سے وہ انسانوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ یخرجھم من الظلمٰت الی النور۔

اسلام نے اپنے سفر کا آغاز ہی علم اور روشنی سے کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے زیورِ تعلیم ہی سے آراستہ فرمایا اور فرشتوں پر ان کے شرف و برتری کا واضح سبب اسی کو قرار دیا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ۔ "اور آدم کو (اللہ نے) سارے نام سکھا دیے۔"

دوسرے مذاہب نے علم کو زندگی کی دوسری ضرورتوں کی طرح محض ایک ضرورت قرار دیا۔ مگر اسلام نے علم کو لازمۂ حیات بتایا۔ اور علم و عبادت اور ایمان و اعتقاد کو ہم معنی قرار دیا۔ اسلام بے مقصد علم کا قائل نہیں، وہ با مقصد علم کا علَم بردار ہے جس کی روشنی میں انسان اپنے خالق کی عظمت و کبریائی کا یقین حاصل کر سکے۔ ایسا ہی علم انسان کو مطلوب ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عقائد سے لے کر عبادات اور اخلاقیات سے لے کر سیاسیات و اقتصادیات اور تمدن و معاشرت تک کی بنیاد علم پر رکھی۔ اسلام دنیا کا پہلا دین ہے جس کو اللہ کی طرف سے لے کر آنے والے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اَلْعِلْمُ سِلَاحِیْ۔ "علم میرا اسلحہ ہے۔"

اس ارشادِ بلیغ کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اقوام و ملل کو بہ زورِ شمشیر اپنے حلقے میں نہیں لاتے، بلکہ اس نور اور روشنی کی بنا پر لاتے ہیں کہ جو خیر و شر، حسن و قبح، توحید و شرک، عظمت و ذلت کامیابی اور ناکامی میں قوت تمیز عطا کرتی ہے اور اسی کا جامع ترین صفاتی نام علم ہے۔ وہی ہمارا اصل ہتھیار ہے جو ہم وہم پرستوں اور حقائق سے نظریں چرانے والوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔

اسلام علم کی اشاعت میں مصروف رہنے والوں کو آخرت میں بلند ترین مقامات کی بشارت دیتا ہے، علماء کے مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "قیامت کے دن عالم کے قلم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے تولی جائے گی۔"

فقط زہد و عبادت پر علم کی فضیلت ظاہر کرتے ہوئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی فضیلت مجھ کو میرے اصحاب میں سب سے کم مرتبہ آدمی پر ہے۔" ایک دوسری حدیث میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ: "جس طرح چودھویں کے چاند کو تمام کواکب پر فضیلت حاصل ہے، اسی طرح عالم کو غیر عالم پر فضیلت حاصل ہے۔"

تزکیۂ نفس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰىهَا ۝ (الشمس۔۹) ''فلاح اُسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے۔''

سورۃ الشمس ہی میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے نفسِ انسانی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس نے اس کو نیکی اور برائی میں تمیز اور فرق کرنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال فرمایا ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ (الشمس۔۸) ''پھر اُس کے دل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اُس کیلئے بدکاری کی ہے، اور وہ بھی جو اُس کیلئے پرہیزگاری کی ہے۔''

اسی خداداد صلاحیت کا اثر ہے کہ آدمی جب اللہ یا اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کرتا ہے، کسی پر کوئی ظلم دانستہ یا نادانستہ کر بیٹھتا ہے یا اس سے کوئی ایسا قول یا فعل سرزد ہو جاتا ہے جو اللہ کے کسی بندے کی دل آزاری کا سبب ہو تو اس کے دل پر ایک غبار سا چھا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے گناہ کی اس تعریف کے ذریعہ سے سمجھایا ہے کہ:

اَلْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ صَدْرِکَ

مطلب یہ کہ گناہ ایک سلیم القلب فرد کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔''

اسلام کی تعلیمات یعنی قرآن حکیم کی آیات اور رسول اکرم ﷺ کے ارشادات سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو شخص اس طرح اپنے ضمیر کی خاموش آواز کو سن لیتا اور اس گناہ کی تلافی کی کوشش کر لیتا ہے تو اس کا نفس گناہ کی کثافت سے پاک ہو جاتا ہے۔ دل کے آئینے کو ہر گناہ سے خواہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو، خواہ حقوق العباد، یا حقوق نفس سے پاک کرنے کی کوشش تزکیۂ نفس ہے۔

انسان کا نفس حقیقت میں ایک بے غبار آئینہ ہے لیکن زندگی کے تقاضے اور اس کے مسائل جو ان گنت، بے شمار اور مختلف النوع ہیں ان کی تکمیل کی تگ و دو انسان کو ہمہ وقت اس گرد و غبار کے زیرِ اثر رکھتی ہے جو اس آئینے کو گدلا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی شعوری زندگی کے ہر شعبے میں تین قسم کے حقوق ادا کرنے کا پابند ہے۔ کارِ دنیا کی انجام دہی کی اس تگ و دو میں آدمی ان تینوں قسم کے حقوق کی ادائیگی میں وہ توازن قائم نہیں رکھ سکتا جو اگر قائم رہے تو آئینہ دل کی صفائی میں فرق نہیں آسکتا۔ یہ فضیلت صرف انبیائے کرام کے حصے میں آتی ہے۔ درحقیقت حقوق اللہ، حقوق العباد، حقوق نفس میں ہر کوتاہی آئینہ دل کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ دل کی اس صفائی کا ہر وقت خیال رکھنا اور شعوری یا غیر شعوری کوتاہی کی وجہ سے اس پر آجانے والے داغ دھبوں اور کدورت کو صاف کرتے رہنا ہی تزکیہ نفس ہے۔ اور نفس کو کدورتوں سے صاف رکھنے کا یہ عمل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے نزدیک حصول فلاح کا ضامن ہے۔

ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا نفس شعوری اور غیر شعوری طور پر غلطیوں، کوتاہیوں، بے احتیاطیوں کی وجہ سے مکدر ہوتا رہتا ہے۔ نفس کی اس خرابی پر متوجہ رہنا اور اس کی صفائی سے غفلت نہ برتنا ہی تزکیہ نفس ہے۔

تربیتِ نفس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ۝ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ۝ (النّٰزعٰت۔۳۹ تا ۴۱)

"تو دوزخ ہی اُس کا ٹھکانا ہوگی، لیکن وہ جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف رکھتا تھا، اور اپنے نفس کو بُری خواہشات سے روکتا تھا، تو جنت ہی اُس کا ٹھکانا ہوگی۔"

نفس کو برائیوں سے روکتے رہنا اور نیکیوں کی طرف اس کے رجحانات کو غالب بنانا اس کی تربیت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز یک بارگی نہیں ہوتی۔ تربیت، قلب و نگاہ کا تازیانہ چاہتی ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم خود اپنے دلوں کو ٹٹولتے رہیں اور اپنی نگاہوں کو اپنے نفس کے تعاقب میں دوڑاتے رہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت ہماری فطرت اور عادت بن جائے اور بدی کا رجحان مغلوب ہو جائے۔

نفس، روح، جان، قالب، وجود، مزاج، طبیعت اور فطرت کے معنوں میں مستعمل ہے اور یہ مختلف معنی قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مبارک کتاب میں سب سے زیادہ یہی لفظ استعمال فرمایا گیا ہے، اور بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ قرآن کریم کا مخاطب انسان اور اس کا نفس ہی ہے۔ خواہ اسے آپ وجود ذات کے معنی میں استعمال کریں یا قلب و روح کے معنی میں یا مزاج و فطرت کے معنی میں۔

اور خالق کائنات نے ہر انسان کی فطرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ اچھائی اور برائی میں فرق کر سکتا ہے، اسی طرح یہ انسانی فکر بھی فطری ہے کہ اچھائیوں کو اختیار کرنا اور برائیوں سے بچنا ضروری ہے۔ دراصل اچھائی برائی، خیر و شر کے درمیان تمیز کرنا ہی انسانیت کا جوہر ہے۔ لیکن عقل کے نہاں خانے سے اس جوہر کو ابھارنے کیلئے مسلسل عمل اور جہد و پیہم کی ضرورت ہے۔ اس کوشش کے بغیر یہ جوہر نہیں ابھر سکتا۔ قرآن کریم نے ہمیں تزکیے و تربیت پر زور دیا ہے اور جس کو کامیابی کا راز بتایا ہے وہ بھی ہم سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عمل مسلسل کے ذریعے اس کی تربیت کرتے رہیں۔ یہ طریقہ بھی خود قرآن شریف ہی نے بتایا ہے:

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت۔۶۹)

"اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے، ہم اُنہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے۔"

انسان ہر طرح کے کشمکش سے گذر کر استقامت کے ساتھ جب نیکی اور پرہیزگاری کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، تو اسے صراطِ مستقیم نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اس راہ میں موانع بہت ہی مشکلات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ نفس خیر و شر کی کشمکش سے ہمیشہ دوچار رہتا ہے۔ برائیاں نفس انسانی میں سر اٹھاتی رہتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے ایمان و عمل کی تربیت پر بھی زور دیا ہے، کیونکہ ایمان تو درحقیقت ایک پودا ہے اور جب سرزمین قلب میں اس کو لگایا جاتا ہے تو اس وقت ثمر آفرین بنتا ہے۔ جب اس کی آبیاری کی جائے اس کی نگہداشت، اس کا احتساب کیا جائے، اپنی نیتوں کا جائزہ لیا جائے۔ اپنے دلوں کو ٹٹولا جائے کہ خوفِ خدا کس حد تک ہے اور اس کی رضا کی طلب کیلئے نفس کون کون سی قربانیاں دے سکتا ہے۔ اس لئے خدا کی رضا کے حصول کیلئے نفس کو مسلسل تربیت کرنی چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو اس میں چھپی ہوئی برائیاں سر اٹھا کر ہمارے ایمان کو تباہ کر ڈالیں۔

حقوقِ نفس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ (المزمل۔۲۔۴)

"رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر باقی رات میں (عبادت کیلئے) کھڑے ہو جایا کرو، رات کا آدھا حصہ! یا آدھے سے کچھ کم کرلو، یا اُس سے کچھ زیادہ کرلو۔"

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کی عبادت سے ہر طرح راضی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ چاہتا تھا کہ آپ ﷺ نفس کے حقوق بھی ادا کرتے رہیں، یعنی آرام بھی کریں، رات کو سویا بھی کریں۔ اس سے نفس اور جسم زیادتی کا شکار نہیں ہوں گے بلکہ انہیں جو ان کا حق ہے وہ ملتا رہے گا۔

اسلامی شریعت اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ انسان احکامِ الٰہی کے دائرے میں رہ کر اس دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرے کہ تمام ابنائے جنس کے حقوق بھی ادا ہوتے رہیں اور نفس بھی ظلم و زیادتی کا شکار نہ ہو۔

حقوق کے معاملے میں اسلام نے یہ امتیاز قائم کیا ہے کہ اس نے انسانی حقوق کی درجہ وار تفصیل بھی مہیا کر دی ہے۔ اور حقوق کی فہرست میں تمام ممکنہ جزئیات کا اس طرح احاطہ کیا ہے کہ کوئی نکتہ تشنہ نہیں رہ گیا ہے۔ انسانوں کے انسانوں پر حقوق ہیں، ان کی درجہ بندی کے علاوہ حیوانات اور نباتات اور جمادات کے حقوق کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ انتہائے احتیاط یہ ہے کہ انسان پر اپنے نفس کا بھی جو حق ہے اس کو بھی بدرجۂ کمال اہمیت دی گئی ہے جو انسان کی اپنی ہلاکت کے مترادف ہو۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم فخرِ رسل، رحمۃ اللعالمین ﷺ کے مطابق ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے بلکہ اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

فَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا. "بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔"

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔"

بعض دوسرے مذاہب میں اس بات کو تقویٰ اور پرہیزگاری سمجھا جاتا تھا کہ انسان اپنے جسم کے اعضا کو زیادہ سے زیادہ مشقت میں مبتلا کرے۔ نفس کی خواہشات کو مختلف غیر فطری طریقوں سے ہلاک کرنے کی کوشش کرے۔ دنیا سے کنارہ کش ہو جائے اور آبادی سے الگ تھلگ دھیان گیان میں مشغول رہے۔ مگر اسلام نے پوری قطعیت کے ساتھ ان غیر فطری اصولوں پر پابندی لگا دی اور اس نے یہ تعلیم دی کہ رہبانیت اور تقشف یعنی اپنے اوپر سختیاں عائد کر لینا اسلام کی نگاہ میں مطلوبہ طریقۂ عبادت نہیں ہے بلکہ اسلام اس کا سخت مخالف ہے۔

اسلام میں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ نفس کو مار ڈالا جائے، بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ نفس کے تمام حقوق ادا کئے جائیں اور اسے زندہ اور کارآمد رکھا جائے۔ لیکن اس طرح کہ نفس فرمانِ الٰہی کے تابع رہے۔ اسلام کا اندازِ فکر یہ ہے کہ نفس کو مار ڈالنا نہیں بلکہ اسے قابو میں رکھنا انسان کا تقویٰ ہے اور تزکیہ نفس منتہائے مقصود ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم افراط و تفریط سے بچتے رہیں۔ عبادت بھی کریں نفس اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کریں۔

استقامت اور ثابت قدمی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ (الشوریٰ۔۱۵)

"اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، (اسی دین پر) جمے رہو، اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو۔"

استقامت وہ ملکہ اور وہ خصوصیت ہے جو انسان کو ترغیب وتحریص اور تخویف وتربیت سے بے نیاز رکھ کر اپنے طے کردہ مقاصد کی تکمیل میں مصروف رکھتی ہے۔

استقامت میں راہِ مستقیم پر تسلسل کے ساتھ چلتے رہنے اور دل جمعی اور مستقل مزاجی سے اپنے اختیار کردہ طریقِ حیات پر قائم رہنے کا مفہوم شامل ہے۔ جبکہ عزم وارادے کی کمزوری استقامت کی ضد ہے۔ جو شخص ان خرابیوں سے دامن بچالے اس میں یہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہ سکتا ہے اور موانع اور مشکلات سے گھبرا کر اور کم اہم ترجیحات کے لالچ میں آکر راہِ راست سے بھٹکنے نہیں پاتا۔ مصلحتیں اسے ابدی نجات کی راہ سے دور نہیں کرسکتیں خواہ یہ اس کی اپنی مصلحتیں ہوں یا دوسروں کی۔ یہاں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ آدمی اپنی مصلحتوں کو تو آسانی سے قربان کردیتا ہے لیکن دوسروں کی مصلحتوں کی رعایت کو نظر انداز کرنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کا واقعہ آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ جب مشرکین مکہ سارا زور وجبر استعمال کرکے بھی آپ کو دعوت حق پیش کرنے سے روک نہ سکے تو انہوں نے آپ کے سرپرست اور حامی ابوطالب پر دباؤ ڈالا کہ یا تو آپ کو منصب نبوت کی تکمیل سے باز رہنے کا مشورہ دیں یا پھر ہم سے دوبدو مقابلے کیلئے تیار ہوجائیں۔ ابوطالب نے ان ہی لوگوں کے سامنے حضور ﷺ کو بلا کر یہ بات بتائی تو آپ ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور قریش کے سرداروں سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ:

"آسمان پر جو یہ سورج چمک رہا ہے کیا آپ کا خیال ہے کہ یہ آپ حضرات کے مطالبے پر روشنی چھوڑ دے گا؟ پھر ابوطالب سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ: "چچا جان! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر رکھ دیں تب بھی میں اس فریضے کی تکمیل سے باز نہ آؤں گا جو اللہ نے میرے اوپر عائد کیا ہے۔

یہ تو صرف ایک واقعہ ہے۔ ورنہ حضور ﷺ کی ساری زندگی اس عزم واستقلال، اس عزیمت واستقامت کی تصویر ہے۔ جس کا آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں پر بھی اثر پڑا اور انہوں نے اس رنگ کو ایسے جذب کیا کہ رہتی دنیا تک کیلئے مثال بن گئے۔

دنیا میں وہی لوگ کامیاب وبامراد ہوتے ہیں جو اپنے مقصد پر یقین کے ساتھ عزم وثبات کے جوہر رکھتے ہوں، ایسے افراد جو اپنی منزل منتخب کرلیتے ہیں۔ اس تک پہنچنے کیلئے راہ کی مشکلات اور راستے کے کانٹوں کی پرواہ کئے بغیر رواں دواں رہتے ہیں۔ استقامت ان صفات میں سے ہے جن کے بغیر کوئی فرد نہ دنیا میں کامران ہوسکتا ہے اور نہ آخرت میں سرخ روئی کی امید کرسکتا ہے۔ آخر میں آپ ﷺ کا ارشاد پڑھ لیں:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ : "اللہ پر ایمان کا اقرار کرو اور پھر اس پر استقامت سے قائم رہو۔"

اللہ تعالیٰ اپنے نبی پاک پر اور آپ کے صحابہ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے اور ہمیں ان کے نقوشِ قدم کی اتباع کی توفیق دے کہ ہم استقلال واستقامت کے ساتھ اپنے ایمان پر قائم رہیں۔

عدل وانصاف

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (المائدہ:۸) ''انصاف سے کام لو، یہی طریقہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔''

جب عدل کا آنچل تار تار ہو جائے تو امن کی حسین زلفیں بکھر جاتی ہیں، جہاں ناانصافی کا سورج آسمان کے جگر میں جل رہا ہو، وہاں شرافت کی دھرتی پر انصاف کی تلاش میں پاؤں جلا ہی کرتے ہیں۔ جہاں ظلم کی خوفناک آندھیاں چلنے لگیں وہاں معاشرہ خشک تنکوں کی مانند بکھر جایا کرتا ہے۔ جس معاشرے کے آنگن (صحن) میں ناانصافی کی تاریکیاں ڈیرے ڈال لیں وہاں انسانیت کے خوں خوار دیو (دشمن) بسیرا کر لیا ہی کرتے ہیں۔ جب عدل کے افق پر بے انصافی کی خونی سرخیاں چھا جائیں تو مظلومیت مارے خوف کے سہم جایا کرتی ہیں۔

اس بات میں شاید ہی کسی کو شک وشبہ ہو کہ انصاف ہی پر امن معاشرے کی بنیاد میں خشتِ اول (پہلی اینٹ) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر بنیاد ہی کمزور اور ضعف سے دوچار ہو تو بڑی بڑی دل کش فلک بوس عمارتیں راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ صدیوں پہلے اس طرف اشارہ کر گئے جب فاطمہ مخزومیہ کا ہاتھ نہ کاٹنے کی سفارش آپ ﷺ سے کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم سے پہلی امتیں اس لئے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں سے کوئی شریف (معزز یا امیر) آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان میں کمزور (معمولی) آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنتِ محمد بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ (تذکارِ صحابیات۔ ص ۵۳۵)

یقیناً انصاف پسند معاشرہ انسان کیلئے عظیم نعمت ہے۔

اگر ہم اپنے معاملات پر گہری نظر ڈالیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ہم خود بھی انصاف پسند نہیں رہے۔ اگر والدین کی حیثیت سے خود کو دیکھیں تو ہم نے اپنی اولاد پر ناانصافی کے تیر برساتے ہوئے ان کو میڈیا کے رحم وکرم پر چھوڑا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ پاکیزہ دل غلط جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ ان کے طور وطریق میں مغربیت چھا گئی۔ ہمارے ادیبوں نے ہمیں مجنوں اور فرہاد کے قصوں میں الجھا کے اپنے مقدس قلم سے ناانصافی کی اور ہم نے والدین جیسے مقدس رشتوں کو صرف ''مدر ڈے'' اور ''فادر ڈے'' تک محدود کر کے اپنے اوپر ستم ڈھایا۔ ہم نے بازاروں کو آباد کیا اور مساجد کو ویرانیوں کے تمغے دے کر ان کو ستم کا نشانہ بنایا۔ زمین دار عشر روک کر غریبوں کے حقوق پر قابض رہا، جب کہ سرمایہ داروں نے زکوٰۃ سے پہلو تہی کر کے غرباء کو بھیک جیسے بھیانک فعل پر مجبور کیا۔ تاجر سامانِ تجارت میں ملاوٹ کر کے ''مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنَّا'' (مسلم) ''جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔'' جیسے حکم کو پامال کرتا رہا۔ اتنی بے انصافیاں کرتے ہوئے جو قوم انصاف کی تلاش میں نکلے تو کیا اپنی منزل پر پہنچ سکے گی ''این خیال است و محال است و جنون''

سب سے پہلے ہمیں خود اپنے معاملات میں انصاف کا دامن تھامنا پڑے گا۔ اپنے معاملے کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ تمام گناہوں سے کنارا کش ہو کر اپنی ظاہری وباطنی اصلاح کرنا ہوگی تو انصاف ہماری دہلیز پر کھڑا ہوگا۔ بشرطیکہ ہم سب منصف مزاج بن جائیں۔

شکرِ ربِ جلیل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۝ (ابراہیم۔۷)

ترجمہ: ''اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا، اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقین جانو، میرا عذاب بڑا سخت ہے۔''

اس آیت کریمہ کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر تم میری نعمتوں پر میری بندگی اختیار کر کے اور میری اطاعت کے ذریعہ سے شکر ادا کرو گے تو میں تم پر مزید احسان کروں گا اور اپنی ان نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ لیکن اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا اور ناشکری کی یعنی بجائے میری بندگی اختیار کرنے کے اپنی خواہشات کے بندے بن کر رہ گئے اور میرے بجائے میری مخلوق میں سے کسی کو اپنا الٰہ قرار دیا تو اس ناشکری کی سخت سزا دوں گا۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے بے شمار احسانات وانعامات اور کرم جو ہم پر ہیں جن سے ہمارے جسم کا رواں رواں، ہمارا بال بال، اور ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کا ہر قدم اللہ رب العالمین کے ان بے پایاں احسانات کا زیر بار اور مرہونِ منت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے ہم پر مزید ایک احسان یہ فرمایا کہ ہم انسانوں کو اپنی اس زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ قرار دیا۔ یہ احسان یہ فضل وکرم انسان کے حق میں اس کی جانب سے یہ اعزاز، اکرام وشرف ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ زندگی بھر ہمارا کوئی لمحہ، ہمارے اوقات کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ ایسا نہ گزرے کہ ہم باری تعالیٰ کا شکر ادا نہ کر رہے ہوں۔ لیکن انسان اپنی فطری کمزوریوں اور طبعی نقائص اور اپنی مادی زندگی کے تقاضوں کی وجہ سے اس بات پر قدرت نہیں رکھتا اور اگر قدرت ہو بھی تو ساری عمر کی شکر گزاری، اظہارِ منت پذیری اور اظہارِ احسان مندی ان تمام احسانات کا حق اور شکر ادا کرنے کیلئے ناکافی ہے۔ خالق کائنات اور اس عاجز انسان کا پیدا کرنے والا جو اس کے نقائص، اس کے عجز اور اس کی کمزوریوں سے بھی پوری طرح واقف ہے۔ اس سے یہ مطالبہ بھی نہیں فرماتا۔ اللہ کے فرمان کے مطابق انسان اللہ کی شکر گزاری کا یہ حق اس کی بندگی اور اس کی اطاعت کر کے ہی ادا کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے احسانات کا شکر ادا کرنا انسان کے بس سے باہر ہے لیکن وہ ان انعامات و احسانات کے اعتراف کے طور پر اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کا پابند ہے۔ جو آدمی ان تمام نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتا اور اس کی بندگی اختیار نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اس کی اس ناشکری کو اور اس کفرانِ نعمت کو کفر قرار دیتا ہے۔

آج مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک اولادِ آدم جن مصیبتوں میں گرفتار ہے کیا یہ اللہ کے اس فرمان کے مطابق ناشکری کا خمیازہ نہیں ہے؟ پھر خاص طور پر ہم امت مسلمہ کے افراد تمام عالم میں جس ناگفتہ بہ حالت میں مبتلا ہیں اور جس نکبت وخواری کا شکار ہیں کیا یہ ہماری عدم اطاعت، عدم فرماں برداری اور کفرانِ نعمت اور ناشکری کا نتیجہ نہیں ہے؟

بہ حیثیت مجموعی اور بحیثیت ملت ہماری ناشکریوں کا یہ عالم ہے کہ نہ ہم اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر بجالاتے ہیں اور نہ ہم اس قابل ہیں کہ آپس کی زندگی میں ایک دوسرے کا احسان مانیں۔ ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں، انسان کی پستی اور انسان میں زوالِ اخلاق کی انتہا اس سے زیادہ کوئی نہیں۔ حالانکہ درحقیقت شکرِ رب جلیل حاصل زندگی ہے۔ تشکر واحسان مندی انسانی اخلاق کے مظاہر ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمارے اخلاق بلند فرمائیں اور ہمیں صراطِ مستقیم پر چلائیں۔ آمین

اخلاصِ نیت اور اخلاصِ عمل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا ج وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَۃِ نُؤْتِہٖ مِنْھَا ط (آل عمران۔۱۴۵)

ترجمہ: ”اور جو شخص دنیا کا بدلہ چاہے گا ہم اسے اس کا حصہ دے دیں گے اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا ہم اسے اس کا حصہ عطا کر دیں گے۔“

اس آیت مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی حاجت مند کی امداد اس لئے کرے کہ لوگ اس کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ کام اس کی نیکی میں شمار نہیں ہوگا، کیونکہ اس کی بنا اخلاص پر نہیں تھی۔

نیت کی درستی اور عمل کے اخلاص کو اسلامی شریعت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح صحت عمل کا مدار نیت پر ہے، اسی طرح نیت کی قبولیت کا انحصار بھی خلوص پر ہے۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ نیت بھی صاف ہو اور عمل بھی، یعنی پر اخلاص ہو۔ چونکہ اسلام میں اخلاص کو بھی عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ اس لئے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں کا مدار اخلاص پر نہیں ہے، اس لئے ان میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی ہوگی۔

اسلام میں جہاد کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ہر شخص پر واضح ہے۔ اسلام کی ترقی اور توسیع کا یہ سب سے زیادہ کامیاب اور موثر ذریعہ ہے۔ اس فریضے کی اہمیت کا انحصار نیت اور عمل کے اخلاص پر ہے۔ مثلاً: اگر کسی شخص نے یہ نیت کی کہ جہاد میں اس کی بہادری کے کارناموں کی لوگ قدر کریں گے تو چونکہ یہ متبرک کام نمود و نمائش اور نام آوری کے جذبے سے ملوث ہو گیا۔ اس لئے آخرت کے نقطۂ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسلام میں اصل اہمیت اخلاص کی ہے، نیت ہو یا عمل دونوں کی اسلامی شریعت میں اسی وقت اہمیت ہوتی ہے کہ جب ان میں اخلاص شامل ہو۔ نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ بھی فخر و نمائش اور ریا یعنی دکھاوے کی خاطر کیا جائے تو ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا۔

اسی طرح ہجرت کا معاملہ ہے، اگر مسلمان ایک ملک سے دوسرے ملک محض ذاتی مفاد کیلئے چلے جائیں تو اس میں ہجرت کا کوئی ثواب نہیں ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نیت اور عمل میں اخلاص اور بے لوثی کا اس زمانے میں بڑا فقدان ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر کام میں اچھی نیت یعنی اچھا ارادہ قائم کریں اور عمل کرتے وقت یہ پیش نظر رکھیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کا اجر صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی خوشنودی ہونی چاہیئے اور اپنے اعمال و افعال میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی ہی ہمارا سرمایہ حیات ہونا چاہیئے۔ آنحضرت ﷺ نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ مسلمان جو عمل کریں اس میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی خوشنودی کے سوا کوئی مقصد سامنے نہ رکھیں۔ اللہ کی خوشنودی اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہی میں ہمارے لئے انفرادی و اجتماعی عظمت پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خلوص کی عظمتوں سے مالا مال فرمائیں اور اخلاص کی رفعتوں سے ہمیں نوازیں۔ (آمین)

اپنی زندگی کا محاسبہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا ؕ وَاِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا ؕ وَکَفٰی بِنَا حٰسِبِیْنَ ۝ (الانبیاء۔۴۷)

یعنی ”اور ہم قیامت کے دن ایسی ترازو لا رکھیں گے جو سراپا انصاف ہوں گی، چنانچہ کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا اور اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا، تو ہم اُسے سامنے لے آئیں گے۔ اور حساب لینے کیلئے ہم کافی ہیں۔“

جب انسان اپنے فکر و عمل کا خود محاسبہ کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کی سوچ اور اس کی فکر بیمار ہو جایا کرتی ہے اور جب وہ آخرت سے بے پرواہ ہو جاتا ہے تو دنیا ہی میں وہ پریشان اور آشفتہ حال ہوتا ہے۔

راہ حق پر چلنے کیلئے قرآن کریم ایک کتاب ہدایت ہمارے پاس موجود ہے اور یہی قرآن ہمیں یہ سبق دیتا ہے اور یہ درس کہ ہم اپنی زندگی کا محاسبہ خود کریں اور ہم غور کریں کہ جو زندگی ہم گذار رہے ہیں اور جو اعمال ہم سے سرزد ہو رہے ہیں، وہ صحیح ہیں یا غلط۔ نیک ہیں یا بد، ہمارے اعمال ہمیں راہِ حق اور صراط مستقیم پر چلا رہے ہیں یا ہم غلط راہوں پر چل رہے ہیں۔ اور اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کو عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے اس عقل کو سب سے پہلے انسان کو خود اپنے محاسبے کیلئے استعمال کرنا چاہیئے۔ محاسبۂ عمل کی سب سے پہلی راہ یہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حَاسِبُوْا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ یہ طے شدہ ہے کہ ایک دن اپنا حساب پیش کرنا ہوگا تو بہتر ہے کہ اس یوم حساب سے پہلے خود ہی اپنا محاسبہ کر لیا کرو۔ ایک حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ: ”عقل مند دانا وہ ہے کہ جو خود ہی اپنا محاسبہ کرتا رہے اور اس وقت کو دھیان میں رکھ کر عمل کرتا رہے جو موت کے بعد آنے والا ہے۔ بے وقوف وہ ہے کہ جو نفس کو تو اس کی خواہشات کے پیچھے لگا دے اور اللہ تعالیٰ سے بہت ساری امیدیں باندھ بیٹھے۔

انسان کا نفس اور انسان کا دل خواہشات کا مرکز ہے اور تمناؤں اور آرزوؤں کی آماجگاہ ہے۔ ان دلی خواہشات پر اور نفسانی آرزوؤں پر فکر و عقل کو نظم اور ضبط قائم کرنا چاہیئے۔ عقل کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ برائی کیا ہے اور اچھائی کیا؟ نیک و بد اور گناہ و ثواب کے مابین عقل انسانی کو فرق کرنا چاہیئے۔ اگر انسانی عقل سے فریضہ انجام نہیں دیتی ہے تو پھر انسان اور حیوان کا فرق مٹ جاتا ہے۔ درحقیقت یہ انسانیت کی موت ہے۔ آدمی کو انسان ہونا میسر اسی وقت ہو سکتا ہے کہ وہ عقل کو سلامت روی کیلئے استعمال کرے۔ اگر سلامتی کی راہ سے انسان ہٹ گیا اور نفس کا غلام ہو کر برائیوں کی گرفت میں آ گیا تو وہ انسان کیسے رہ سکتا ہے۔ دراصل محاسبہ عمل اسی کا نام ہے کہ انسان جو کام کرے اس پر پہلے غور کرے اور جب کام کر چکے تو محاسبہ کرے کہ وہ صحیح تھا یا غلط۔ اگر دل یہ گواہی دے اور ضمیر یہ پکارے کہ ہمارا عمل غلط تھا، ہمارا اقدام صراطِ مستقیم سے ہٹا ہوا تھا تو توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ہر وقت خود احتسابی اور اپنے اعمال کا خود محاسبہ کرنا ہی دراصل یوم حساب کی شرمندگی سے بچا سکتا ہے۔

آیئے ہم غور کریں اور فیصلہ کریں کہ ہم اس دنیا میں انسان بن کر رہیں گے اور اچھے عمل کریں گے اور اس دنیا کو گہوارۂ امن بنائیں گے اور قرآن و سنت کو ہم اپنا شعار بنائیں گے۔

برائیوں سے اجتناب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ۔(آل عمران۔۱۱۰)

”(مسلمانو!) تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کیلئے وجود میں لائی گئی ہے۔تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو۔“

قرآن حکیم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اچھائیوں کی تلقین کریں اور برائیوں سے روکیں۔قرآن کی یہ ہدایت محض ایک ترغیبی نصیحت کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ اس کو امت مسلمہ کا فریضہ قرار دیتا ہے اور اس عمل کو مسلمانوں کیلئے وجہ امتیاز قرار دیتا ہے۔

قرآنی تعلیم کا مقصد انسان کو ایک ایسا مثالی انسان بنانا ہے جو خیر و فلاح کا نمونہ ہو اور جس کا وجود اپنے ہم جنسوں کے علاوہ کائنات کے ہر وجود بلکہ ہر شے کیلئے رحمت و رافت ہو۔انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض بنایا گیا ہے، اللہ کے نائب کی حیثیت سے انسان کو وہی کچھ کرنا چاہیئے جس کیلئے اس کو یہ حیثیت دی گئی ہے اور جس کیلئے اس کو مامور کیا گیا ہے۔اللہ کی مرضی یہی ہے کہ اس کی زمین میں نیکیاں اور اچھائیاں پھلیں پھولیں، خیر و فلاح کا دور دورہ ہو، امن و راحت عام ہو، شرافت و انسانیت کا بول بالا ہو، دیانت و امانت کا چلن ہو، برائیاں سر اٹھانے نہ پائیں، ظلم و زیادتی کا نام نہ ہو، ناانصافی نہ ہو، کذب و بہتان کی گنجائش نہ ہو۔اسلام ایسا ہی معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، اس لئے وہ ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں نیکی کرنا آسان ہو اور برائی کرنا نہایت مشکل ہو۔

اس لئے برائیوں سے بچنے کیلئے محض وعظ و نصیحت ہی کافی نہیں، محض قاعدے، قانون بنا دینا ہی کافی نہیں۔اس کیلئے وہ فضا اور وہ ماحول بھی ضروری ہے جس میں انسان کیلئے برائیوں سے دور رہنا ممکن ہو جو انسان برائی نہ کرنا چاہے اس کو کوئی برائی کرنے پر مجبور نہ کرے، جو لوگ رشوت نہ دینا چاہیں ان کو رشوت دینے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔اس طرح جو لوگ رشوت نہ لینا چاہیں ان کو مشکلات پیش نہ آئیں، ان کی قدر کی جائے، ان کو عزت کا مقام اور دیانت کی روزی میسر آسکے۔اسی طرح ہر بدی سے اجتناب کیلئے ماحول سازگار ہو اور نیکی کے اختیار کیلئے ماحول مددگار ہو۔اس سلسلے میں ایک نقطہ عرض کردوں کہ اگر افراد کو برائیوں سے محفوظ رکھنا ہے تو اس کیلئے ہمیں مثبت اقدام کرنے ہوں گے اور لوگوں سے بری عادتوں کو چھڑانے کیلئے ان کو اچھی عادتوں کی ترغیب دینی ہوگی۔جھوٹ کی عادت اسی وقت چھوٹ سکتی ہے کہ جب سچ بولنے کی عادت اس کی جگہ لے لے۔یہ انسانی فطرت ہے کہ جب تک وہ اچھی عادتیں اختیار نہ کرے اس وقت تک وہ بری عادتیں نہیں چھوڑ سکتا اور اس مقصد میں اسی وقت کامیابی ہوسکتی ہے کہ جب ہر خاص و عام اس کا عزم کرلے کسی ایک طبقے پر اس کام کو نہ چھوڑا جائے۔جب تک مجموعی طور پر ملت اور ملت کا ہر فرد اس مقصد کو عزیز نہ جانیں، یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔برائیوں کے نتائج بھی ساری قوم بھگتی ہے اور برائیوں سے دور رہ کر نیکیوں کو اختیار کرنے کے ثمرات بھی ساری ملت کو حاصل ہوں گے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

علمائے حق کی بے ادبی سخت گناہ ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا (الحجرات)

"اے ایمان والو! نہ تو مرد دُوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اُڑا رہے ہیں) خود اُن سے بہتر ہوں۔"

تو جو شخص علمائے حق کی غیبت کرتا ہے وہ گویا ان کا گوشت کھاتا ہے۔ مگر ان کا گوشت زہر آلود ہے۔ جو شخص اس کو کھائے گا اس کا دین تباہ ہو جائے گا۔ علماء، اولیاء اللہ (نیک لوگوں) کی بے ادبی کرنا بہت مہنگا سودا ہے۔ نیک آدمی، پھر عالم باعمل بھی ہو تو ان کی بے ادبی یا بے عزتی یا گستاخی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ کبھی کسی عالم کی توہین نہیں کرنی چاہیئے۔ احادیث کی روشنی میں ذرا غور سے اس مضمون کو پڑھیئے تاکہ ہماری آنکھیں کھلیں اور دن رات جو ہم علماء اور مولویوں کو برا کہتے ہیں، حالانکہ صرف داڑھی رکھنے سے کوئی مولوی تھوڑا ہی بن جاتا ہے۔ مولوی کا معنیٰ "اللہ والا" ہے چاہے وہ عالم ہو یا نہ ہو۔ "مولنا" کا معنی ہمارے آقا یعنی "ہمارے بڑے" ہوتا ہے جب کہ عرف میں مولنا عالم دین کو کہتے ہیں۔ الغرض کسی اللہ والے نیک شخص کو بالخصوص عالم دین کو برا کہنا سنگین سے سنگین جرم ہے۔

حدیث کے حافظ امام ابن عساکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خوب سمجھ لو! علماء کے گوشت زہر آلود ہیں اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت معلوم و مشہور ہے کہ علماء کی تنقیص و توہین کرنے والوں کو رسوا کر دیتے ہیں اور جو شخص علماء پر عیب گیری کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مرنے سے پہلے دل کی موت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص ہم میں سے (یعنی مسلمانوں میں سے) نہیں جو ہمارے بوڑھوں کی تعظیم نہ کرے اور ہمارے بچوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے عالموں کی قدر نہ کرے۔ (کتاب الزواج) حدیث شریف میں ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "تین آدمی ہیں جن کی بے ادبی و بے عزتی صرف منافق ہی کر سکتا ہے۔ (۱) بوڑھا مسلمان (۲) عالم (۳) انصاف کرنے والا بادشاہ۔ (طبرانی۔ ترمذی) ان روایات سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں لیکن پھر بھی بخاری شریف کی حدیث قدسی کبھی نہ بھولئے کہ حضرت انس و حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے منقول روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے کسی ولی کی توہین کرتا ہے اس نے گویا مجھے اعلانِ جنگ دے دیا۔

علماء اور اولیاء کی بے ادبی کو بہت سے حضرات نے کبیرہ گناہ شمار کیا ہے اور علامہ زرکشی شارح بخاری نے مذکورہ حدیث کی شرح میں فرمایا ہے کہ اس حدیث میں غور کیجئے کہ علماء اور اولیاء اللہ کی بے ادبی کی سزا سود خوروں کی سزا کے برابر کر دی گئی ہے۔ سود خوروں کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سود کھانے والے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اور رسول ﷺ کی جنگ کیلئے تیار ہو جائیں۔

جب کبھی کسی عالم دین سے غلطی ہو جائے تو ہمیں تین کام کرنے چاہئیں: (۱) ان کی غلطی کا چرچا نہ کریں (۲) ان کی غلطی پر عمل نہ کریں (۳) ان کو غلطی سے نکالنے کیلئے دعا شروع کر دیں۔ اس لئے کسی نے کیا خوب کہا ہے (۱) عالم بن (۲) یا طالب علم بن (۳) یا غور سے سننے والا بن (۴) یا محبت کرنے والا بن۔ اور پانچواں نہ بن ورنہ ہلاک ہو جائے گا اور پانچواں یہ ہے کہ علم اور اہل علم سے بغض رکھے۔

آج کل ہم اس بے لذت گناہ میں کتنے مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہمیں ہر کسی کی بے ادبی بالخصوص علماءِ حق اور اولیاء اللہ (نیک لوگوں) کی بے ادبی سے محفوظ فرمائیں۔ (آمین)

دعوت کے آداب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ قف ”(اے پیغمبر!) کہہ دو کہ: ”یہ میرا راستہ ہے۔“ (یوسف۔۱۰۸)

یعنی میرا راستہ یہ ہی خالص توحید کا راستہ ہے۔ میں تمام دنیا کو دعوت دیتا ہوں کہ سب خیالات واوہام کو چھوڑ کر ایک خدا کی طرف آئیں۔ اس کی توحید، اس کی صفات وکمالات اور اس کے احکام وغیرہ کی صحیح معرفت صحیح راستہ سے حاصل کریں۔ سورہ النحل کی آیت نمبر ۱۲۵ میں ارشاد ہے بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سنا کر بھلی طرح اور الزام دے ان کو جس طرح بہتر ہو۔

اس آیت کریمہ میں خود پیغمبر علیہ السلام کو تعلیم دی جارہی ہے کہ لوگوں کو راستہ پر کس طرح لانا چاہیئے۔ اس کے تین طریقے بتلائے، حکمت سے یعنی نہایت پختہ مضبوط دلائل، حکیمانہ انداز سے پیش کیے جائیں جن کو سن کر فہم وادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا سکے، دوسرا موعظہ الحسنہ مؤثر اور رقت انگیز نصیحتوں سے عبارت ہو جن میں نرم خوئی اور دل سوزی کی روح بھری ہو۔ تیسرا اگر بحث کا موقع پیش آئے تو بہترین طریقہ سے تہذیب، شائستگی، حق شناسی اور انصاف کے ساتھ بحث کرو۔ اپنے حریف مقابل کو الزام دو تو بہترین اسلوب سے دو۔ اس آیت مبارکہ میں دعوت وتبلیغ کا مکمل نصاب، اس کے اصول اور آداب کی پوری تفصیل چند کلمات میں سموئی ہوئی ہے۔ لہٰذا عمدہ داعی میں مندرجہ ذیل صفات ہونی چاہئیں:

☆ پہاڑ کی طرح مضبوط ہو ☆ اونٹ کی طرح مجاہد ہو ☆ آسمان کی طرح بلند ارادے رکھتا ہو ☆ زمین کی طرح اس میں عاجزی ہو ☆ اسے دین کا فکر ہو ☆ دین کے مٹنے کا غم ہو

☆ دنیا میں دین پھیلانے کا جذبہ ہو ☆ دل میں دنیا کی محبت نہ ہو ☆ امت کیلئے دل میں قدر ومحبت ہو ☆ دل میں عاجزی و انکساری ہو ☆ اعمال کی پابندی کرنے والا ہو، اعلیٰ وعمدہ اخلاق کا مالک ہو ☆ اس کے دل میں اخلاص کوٹ کوٹ کر بھرا ہو ☆ کامیابی کو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی عنایت اور امداد سمجھے ☆ لوگوں کی تکلیفوں پر صبر کرنے والا ہو ☆ لوگوں کے نہ ماننے پر مایوس نہ ہو ☆ ہر عمل کے آخر میں استغفار کرنے والا ہو۔

ایک داعی کیلئے ان چار چیزوں کی پابندی بھی ضروری ہے:

☆ امیر کی اطاعت کرنے والا ہو ☆ آنکھوں کی حفاظت کرنے والا ہو ☆ تکبیر اولیٰ کی پابندی اور نماز تہجد کی پابندی کرنے والا ہو ☆ اجتماعی اعمال کی پابندی کرنے والا ہو۔

کیونکہ لفظ تبلیغ میں پانچ حروف ہیں (ت، ب، ل، ی، غ)

ت.....سے.....تکلیف۔ ب.....سے.....برداشت۔ ل.....سے.....لگن یعنی لگاتاری.....سے.....یقین۔

غ.....سے.....غیبی مدد

یعنی تبلیغ کا مطلب ہے کہ تکالیف برداشت کرتے ہوئے یقین اور لگن کے ساتھ لگاتار (تسلسل) اس کام کو کرتے رہنا جس میں اللہ کی غیبی مدد شامل ہو۔

مسلسل عمل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج (حم السجدہ ۳۰۔۳۱)

''(دوسری طرف) جن لوگوں نے کہا ہے کہ: ''ہمارا رب اللہ ہے۔'' اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے تو اُن پر بیشک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اُتریں گے کہ: ''نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اُس جنت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (۳۰) ہم دُنیا والی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی تھے، اور آخرت میں بھی رہیں گے۔''

عمل پیہم (مسلسل عمل) کا تعلق انسان کے اخلاق اور کردار سے ہے۔ یہ ان اخلاقی فضائل ومحاسن میں ہے جس سے محرومی کی بنا پر معاشرے میں انسان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ جاتی۔ کسی منزل پر پہنچنے کیلئے جہدِ مسلسل وہی کرتا ہے جو اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ جمود اور تعطل خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، زوال کی علامت ہے اور عمل مسلسل عروج وترقی کی نشانی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے جب حضور اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ یارسول اللہ! ﷺ مجھے اسلام کی ایک جامع بات بتا دیجئے جس کے بعد مجھے کسی اور سے پوچھنا نہ پڑے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''تم اللہ پر ایمان لانے کا اقرار کرو اور اس پر قائم رہو۔ بہ ظاہر یہ مختصر الفاظ پر مشتمل نصیحت بہت سادہ اور سیدھی معلوم ہوتی ہے، مگر غور تو کیجئے کہ ان مختصر الفاظ میں کس طرزِ زندگی کی طرف رہنمائی فرمائی جارہی ہے اور کس معیارِ اخلاق وکردار کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔

دراصل پہلا مطالبہ ایمان، دوسرا مطالبہ اس کی جملہ مقتضیات کی تکمیل کا ہے۔ ایمان جس صدق وراستی، اخلاص، اتحاد اور جہد مسلسل کا تقاضا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نیز بندوں کے جو حقوق بتاتا ہے ان کو مسلسل اور نامساعد حالات میں بھی انجام دیتے رہنا ہی تقاضائے ایمان کی تکمیل ہے اور جس نے ایسا کرلیا وہ اس معیار کے ایمان وعمل تک پہنچ گیا جہاں انسان کو لانا مقصود ہے۔

مسلسل عمل کی تاکید اس بات کی غماز ہے کہ باطل کی ساری طاقتیں تمہارے اس عقیدے سے ٹکرائیں گی۔ اگر تم ثابت قدم اور مسلسل عمل کرتے رہے تو تم نے ایمان کا حق ادا کردیا۔ اسی لئے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے جب مستقل مزاجی کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ''فرائض کی ادائیگی کا نام استقامت ہے۔'' بے شک اس کے مقامات بھی بڑے نازک ہیں اور نوبت کبھی کبھی رسن ودار تک آجاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی سارے فرائض ادا کرتا رہا ہے تو اس نے بھی عمل کی بلندیوں کو چھولیا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ایمان واعتقاد کے بعد ہم سے مسلسل عمل ہی کا تقاضا کیا گیا ہے، اور جمود وتغافل، خواہ معاش ومعیشت کی راہ میں ہوں یا عبادات ومعاملات میں یا علوم وفنون میں، اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک مذموم باتوں میں سے ہے۔ جس چیز کو کتاب وسنت میں استقامت کہتے ہیں درحقیقت وہ عمل مسلسل ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے کہ استقامت محض ثبات نہیں بلکہ عمل کے دوام کی کیفیت کو کہتے ہیں اور آیت استقامت میں جو بشارت ہے اس کے مستحق وہ بھی ہیں جو حسن عمل میں مداومت رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ کو وہی اچھے کام محبوب ہیں جن پر پابندی سے اور تسلسل کے ساتھ عمل کیا جائے۔'' اللہ ہمیں استقامت نصیب فرمائیں۔ (آمین ثم آمین)

آداب مساجد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ لا یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝

''جن گھروں کے بارے میں اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ اُن کو بلند مقام دیا جائے، اور اُن میں اُس کا نام لے کر ذکر کیا جائے، اُن میں صبح وشام وہ لوگ تسبیح کرتے ہیں۔'' (سورۃ النور۔۳۶)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی (شخص) مسجد میں دنیاوی باتیں کرنے لگتا ہے تو فرشتے اس کو کہتے ہیں: ''اے اللہ کے ولی! خاموش ہو جا۔ پھر (بھی) اگر بات کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں: ''اے اللہ کے دشمن چپ ہو جا۔ پھر (بھی) اگر بات کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں: تجھ پر اللہ کی لعنت ہو، خاموش رہ''۔ (کتاب المدخل جلد۲ ص ۵۵)

مسئلہ: اگر آدمی گفتگو کے ارادہ سے مسجد میں نہ بیٹھے، اتفاقاً کوئی دنیاوی ضروری بات آہستہ سے کر لے تو (کچھ) حرج نہیں، البتہ بچنا بہتر ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد۲ ص ۱۶۱)

حضرت خلف بن ایوب رحمہ اللہ مسجد میں بیٹھے تھے کہ ان کا غلام (ان سے) کچھ پوچھنے کیلئے آیا۔ آپ مسجد سے اٹھ کر باہر گئے اور اس کی بات کا جواب دیا۔ کسی نے (ان سے) اس طرح باہر نکلنے کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے میں نے اتنے سالوں سے مسجد میں کبھی کوئی دنیاوی بات نہیں کی اس لئے (مجھے) آج بھی یہ گوارا نہ ہوا کہ مسجد میں ایسی (دنیاوی) بات کروں۔

حضرت فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے ہاں کسی بندے کا مرتبہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اللہ کے احکام کی تعظیم کرتا ہے۔ اس کے گھروں اور بندوں کا احترام کرتا ہے اور مساجد اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں۔ لہٰذا مومن کو ان کی تعظیم کرنی چاہیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہی کی تعظیم ہے۔ کسی زاہد (بزرگ) کا بیان ہے کہ میں نے مسجد میں کبھی کسی چیز سے ٹیک نہیں لگائی اور نہ (مسجد میں) کبھی پاؤں پھیلائے اور نہ ہی کبھی کوئی دنیا کی بات کی۔ اور (میں نے) یہ بات اس لئے بتائی کہ لوگ اسے اپنانے کی کوشش کریں۔ درج ذیل باتیں احترام مسجد میں داخل ہیں:

☆ مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کہے جب کوئی نماز میں مشغول نہ ہو اگر (مسجد میں) کوئی بھی نہ ہو یا لوگ نماز میں (مشغول) ہوں تو یہ کلمات کہے: اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا مِنْ رَّبِّنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ ۝ ''ہمارے رب کا سلام ہم پر اور اس کے نیک بندوں پر۔''

☆ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھے۔ (اگر وقت مکروہ نہ ہو) ☆ مسجد میں کوئی خرید وفروخت نہ کرے۔ ☆ مسجد میں نیام سے تلوار نہ نکالے۔ ☆ مسجد میں کسی گمشدہ چیز کا اعلان نہ کرے۔ ☆ ذکر اللہ کے بغیر آواز بلند نہ کرے (ذکر اللہ بلند آواز اس وقت جائز ہے جبکہ کوئی نماز میں مشغول نہ ہو)۔ ☆ مسجد میں کوئی دنیاوی بات نہ کرے۔ ☆ لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے۔ ☆ مسجد میں جگہ سے متعلق کسی سے جھگڑا نہ کرے۔ ☆ صف میں تنگی پیدا نہ کرے ☆ نمازی کے سامنے سے نہ گزرے۔ ☆ مسجد میں مت تھوکے۔ ☆ مسجد میں انگلیاں نہ چٹخائے۔ ☆ مسجد کو گندگی، دیوانوں، بچوں اور حد لگانے (سزا دینے) سے محفوظ رکھے۔ ☆ مسجد میں اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرے اور (اس میں) ذرا غفلت نہ کرے۔ اللہ رب العزت ہمیں مساجد کا ادب واحترام کرنے کی توفیق دیں۔ (آمین)

اللہ کی نعمتیں اور ان کے مقاصد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا ؕ (النحل۔۱۸) ”اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو، تو انہیں شمار نہیں کر سکتے۔“

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ ہمارے پاس ہر نعمت رب العالمین کی عطا کردہ ہے اور وہی اس نعمت کا خالق و مالک ہے اور اس نے اس کا کوئی اصل مقصد بھی رکھا ہوگا۔

ہر نعمت کے ساتھ دو چیزیں وابستہ ہیں۔ ”اصلی مقصد، ضمنی مقصد“۔ اصلی مقصد وہ ہے جس کام کیلئے جو نعمت ملی ہے وہ اس کا اصلی مقصد ہے۔ اگر نعمت سے اصلی مقصد کے علاوہ کوئی دوسرا جائز کام بھی لے لیں تو یہ اس کا ضمنی مقصد ہوا۔

مثال کے طور پر جوتے کا اصلی مقصد پاؤں کی حفاظت ہے لیکن کسی بچھو کے نظر آنے پر جوتے سے بچھو کو مار دیا تو یہ جوتے کا ضمنی مقصد ہے۔ اصل مقصد وہ ہے جس کیلئے بنانے والے نے اس کو بنایا ہے۔

بازار کی بنی ہوئی چیزوں کا اصل مقصد موجود ہے تو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی بنائی ہوئی نعمتوں کا اصل مقصد بھی ضرور ہوگا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی بے شمار نعمتوں میں سے پانچ نعمتیں بہت بڑی ہیں:

(۱) انسان کے پاس سب سے بڑی نعمت زندگی ہے۔ (۲) دوسرے درجے میں عقل کی نعمت ہے۔ (۳) قوت سماعت سننے کی طاقت۔ (۴) نعمت بصر آنکھ کی نعمت۔ (۵) زبان کی نعمت، جس سے دل کا مقصد ظاہر کیا جاتا ہے۔

☆ زندگی کا اصل مقصد بندگی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے اسے بجالائے، بندگی بندہ سے ہے۔ بندہ کا معنی ہے غلام۔ قیدی ہے کہ بندہ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کا مقید ہے۔

☆ عقل۔ عقل انجام کار کا سوچتی ہے، عقل کی نعمت اس لئے دی گئی ہے کہ اس کے ذریعے حق و باطل نیکی و بدی کی پہچان کریں۔

☆ قوت سماعت۔ سننے کی طاقت کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی موعظت و نصیحت کو سنیں۔

☆ قوت بصارت۔ دیکھنے کی قوت اس لئے دی گئی ہے کہ اس سے نیک لوگوں کے اموال دیکھ کر روح و دماغ تک پہنچائیں۔

☆ زبان۔ بولنے کی نعمت کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ کے کلام کی تلاوت کر سکیں اور دوسروں کو دل کی بات بتا سکیں۔ موجودہ دور میں اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں دنیاوی کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ دنیا کے خوب کام ہو رہے ہیں، یہ سب نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ابدی و اخروی زندگی کمانے کیلئے عطا کی تھیں مگر ہم نے انہیں جوتے کی طرح ضمنی مقصد میں لگا دیا۔

دنیا ضرور کماؤ مگر اصل مقصد کو فراموش نہ کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو ان کے اصل مقصد میں صرف نہ کرو گے تو اس میں تمہارا اپنا نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دین کی ترغیب دیتا ہے تو اسے یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ محتاج ہے، حالانکہ اللہ کی ذات غنی ہے اور باقی سب فقیر ہیں۔

اسلام ہمیں ترک عمل نہیں سکھاتا بلکہ اسلام کہتا ہے کہ جائز طریقے سے دنیا کماؤ مگر اپنی زندگی کے اصل مقصد کو فراموش نہ کرو۔ حضور ﷺ نے تجارت بھی کی ہے، تبلیغ بھی کی ہے، حج و عمرہ بھی کیا ہے اور جنگیں بھی لڑی ہیں۔ مطلب یہ ہے اسلام ترک عمل کا حکم نہیں دیتا صرف یہ کہتا ہے کہ آخرت کو مت بھولو بلکہ آخرت کی تیاری کرو جس کیلئے زندگی کی نعمت عطا ہوئی ہے۔

دوسروں کو تکلیف سے بچائیے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ (المائدہ،۸۷) ''اور حد سے تجاوز نہ کرو۔''

اسلامی فقہ کی تمام کتابوں میں یہ اصول لکھا ہوا ہے کہ عام راستوں پر چلنا اور کوئی سواری چلانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ چلنے والا دوسروں کی زیادتی کا باعث نہ بنے۔ یعنی ہر ایسے کام سے بچے جو کسی دوسرے شخص کیلئے تکلیف یا خطرے کا باعث بن سکتا ہو۔ اس احتیاط کے بغیر اس کیلئے سڑک کا استعمال ہی جائز نہیں جو تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے اور اگر اس میں بے احتیاطی کے نتیجے میں کسی شخص کو کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچ جائے تو اس کا سارا تاوان شرعی اعتبار سے اس شخص کے ذمے عائد ہوتا ہے، جس نے بے احتیاطی کے ساتھ سڑک کو استعمال کیا۔

غور فرمایئے! اگر ایک شخص سگنل توڑ کر گاڑی آگے لے گیا، یا اس نے کسی ایسی جگہ سامنے والی گاڑی کو اوورٹیک کیا جہاں ایسا کرنا ممنوع تھا بظاہر تو یہ معمولی سی بے قاعدگی ہے لیکن درحقیقت اس معمولی سی حرکت میں چار بڑے گناہ جمع ہیں:

(۱) قانون شکنی اور حاکم کے جائز حکم کی نافرمانی (۲) وعدہ خلافی (۳) کسی کو تکلیف پہنچانا (۴) سڑک کا ناجائز استعمال

یہ گناہ ہم دن رات کسی تکلیف کے بغیر اپنے دامن میں سمیٹ رہے ہیں اور ہمیں کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہے۔

بعض اوقات کسی ایک شخص کی بے قاعدگی سینکڑوں انسانوں کا رستہ ہی بالکل بند کر دیتی ہے۔ مثلاً سڑک کے ایک حصے میں اگر کسی وجہ سے ٹریفک رک گیا تو بعض جلد باز لوگ تھوڑے سے انتظار کی زحمت گوارا کرنے کی بجائے سڑک کے اس حصہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں جو آنے والی ٹریفک کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنے والی گاڑیوں کا راستہ رک جاتا ہے اور گھنٹوں تک ٹریفک اس طرح جام ہو جاتا ہے کہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

اس قسم کی بے قاعدگی درحقیقت ''زمین میں فساد'' کی تعریف میں آتی ہے اور سینکڑوں انسانوں کو کرب و عذاب میں مبتلا کرنے کا گناہ اس شخص پر ہے جس نے غلط سمت گاڑی لے جا کر اس صورت حال سے لوگوں کو دوچار کیا۔

یہ دین کی برکات ہیں کہ اس نے زندگی کے تمام چھوٹے بڑے امور کے بارہ میں اپنی مبارک ہدایات سے نوازا ہے اور مسلمان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کے متعلق اسلام کے فطری اصول نہ بتا دیئے گئے ہوں۔ بظاہر ڈرائیونگ ایک ایسا کام ہے جس کے بارہ میں عام مسلمان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کام کے متعلق اسلام ہمیں کیا ہدایات دیتا ہے؟ اس کے متعلق اصولی بات یہ ہے کہ عام راستوں پر چلنا اور کوئی سواری چلانا دوسروں کی سلامتی کی ضمانت کی شرط کے ساتھ جائز ہے کہ ہر ایسے کام سے بچا جائے جو کسی دوسرے شخص کیلئے زیادتی یا تکلیف یا خطرہ کا سبب بن سکتا ہو۔

لہٰذا سڑک پر جہاں پانی وغیرہ جمع ہو وہاں آرام سے چلیں تاکہ ناپاک پانی اڑ کر پیدل چلنے والوں کے کپڑوں پر نہ پڑے، اس طرح ان کو تکلیف بھی ہوگی اور کپڑے بھی ناپاک ہوں گے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد پاک ہے: ''اپنے شر سے دوسروں کو روکو۔'' اس جملہ میں غور و فکر کرنے سے ہر آدمی ایسے تمام امور سمجھ سکتا ہے جو دوسروں کی تکلیف و زیادتی کا ذریعہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے تمام کاموں سے بچائیں جو دوسروں کی تکلیف اور زیادتی کا ذریعہ ہوں۔ (آمین)

توبہ میں دیر مت کرو

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ ۙ

"اللہ کے حضور سچی توبہ کرو۔ کچھ بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہاری بُرائیاں تم سے جھاڑ دے، اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کر دے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔"

جس مسلمان کے پاس صرف کلمہ ہی کی دولت ہے، عمل اس کا ضعیف ہو یا نہ ہونے کے برابر۔ وہ اس حالت کے قریب ہے کہ ذرا سی تند و تیز ہوا اس کے ایمان کا پودا جڑ سے اکھاڑ جائے۔ ملک الموت کے آنے کے وقت جو خوف و خطر پیش آتے ہیں ان کے صدمے کے باعث ایمان ہل جاتا ہے۔ پس جس کے ایمان کی جڑ یقین کی گہرائی میں جمی نہ ہوگی اور اعمال میں اس کی شاخیں پھیلی نہ ہوں گی، وہ ملک الموت کے ظاہر ہونے کے وقت خوف کے جھونکوں میں عام طور پر نہ ٹھہر سکے گا۔ ڈر ہے کہ اس کا خاتمہ اچھا نہ ہو، خاتمہ کے وقت وہ ایسا ہی مضبوط اور اچھا رہتا ہے، جس کی بنیاد طاعت پر ہمیشہ رہی ہو اور اعمال کی آبیاری سے مضبوطی پکڑ گیا ہو۔

توبہ کے معنی یہ ہیں کہ جو راستہ خدا تعالیٰ جل شانہٗ سے دور کرے اور شیطان سے نزدیک، اس سے پلٹ آنا۔ یہ رجوع یا پلٹنا انسان عاقل ہی سے ہو سکتا ہے اور اصل عقل انسانی کمال کو پہنچتی ہے چالیس برس پر۔ اگرچہ بنیاد عقل کی سن بلوغ پر پوری ہو جاتی ہے۔ شہوت اور غضب و غصہ وغیرہ البتہ پہلے سے آموجود ہوتے ہیں اور یہ سب لشکر ہیں شیطان کے۔ جبکہ عقل لشکر ہے اللہ تعالیٰ کا، جب دونوں اکٹھے ہوتے ہیں تو ان میں بالضرور لڑائی چھڑ جاتی ہے۔ ایک کے ہوتے ہوئے دوسرا قائم نہیں رہ سکتا۔ پس جو ان میں سے غالب ہو جاتا ہے وہ دوسرے کی جڑ ہی اکھاڑ دیتا ہے۔ اب شہوت چونکہ چھوٹی عمر ہی میں کامل ہو جاتی ہے اس لئے شیطان کا مورچہ عقل سے پہلے جم جاتا ہے۔ دل کو عادتاً تقاضائے شہوت سے انس و الفت غالب ہو جاتی ہے اور ان سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ پھر جب عقل ظاہر ہوتی ہے وہ دوستوں کو دشمنوں سے بتدریج بچاتی ہے۔ پس اگر اس میں قوت و کمال نہ ہو تو میدان جنگ شیطان کے ہاتھ رہتا ہے اور اگر عقل کامل اور قوی ہوئی تو پہلا کام یہ کرتی ہے کہ شیطانی لشکروں کی جڑیں اکھاڑتی ہے۔ اس طرح کہ شہوتوں کو توڑتی ہے اور بری عادات چھڑاتی ہے اور طبیعت کو زبردستی عبادت پر لاتی ہے۔ توبہ میں رجوع الی اللہ پایا جاتا ہے۔ جس راستہ کا رہبر شہوت اور ساتھی شیطان ہے اس راہ سے عقل نے انسان کو پلٹا کر اللہ کی راہ پر ڈالا۔ چونکہ یہ امر ہر آدمی میں ضروری ہے، اس لئے جو جو کام شہوات کی موافقت سے کئے ہوں ان سے رجوع کرنا، ان سے باز آنا ہر آدمی کیلئے ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ ہر شخص کے حق میں فرض عین ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا: جان پدر! توبہ میں دیر مت کرنا، کیونکہ موت ناگہانی آجاتی ہے جو شخص آج کل پہ ٹالتا رہتا ہے دو بڑے خطروں میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایک تو دل کی تاریکی بڑھتے بڑھتے مٹنے کے قابل نہ رہے گی، دوسرے اچانک مرض، حادثہ یا موت کے پنجے میں پھنس جائے گا تو مہلت تدارک کی نہ ملے گی۔ جو عام لوگ ہلاک ہوئے عموماً ٹالنے ہی کے سبب ہلاک ہوئے اور خدائے پاک کے پاس روگی دل لے کر گئے۔ حالانکہ اللہ کریم کے دربار میں صاف ستھرا دل لے کر جانا چاہیئے۔ نجات اس کو ہوگی جس کے دل میں روگ نہ ہو۔ دل خدا تعالیٰ کی امانت تھی جو شخص امانت میں خیانت کرے گا اور اس خیانت کا تدارک نہ کرے گا اس کا انجام خطرناک ہے۔ جو صحیح سچی اور بروقت توبہ کرلے اس کی توبہ مقبول ہوتی ہے اور قلب سلیم یعنی جس کے اندر کوئی روگ نہ ہو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہوتا ہے۔ وہ آخرت میں اس کریم کے قرب میں مزے اڑائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق توبہ عطا فرمائیں۔ (آمین)

نماز کو پورے اہتمام سے ادا کرو

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ۝ وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ ۝ (البقرہ۔ ۲۳۸)

"تمام نمازوں کا پورا پورا خیال رکھو، اور (خاص طور پر) بیچ کی نماز کا۔ اور اللہ کے سامنے باادب فرماں بردار بن کر کھڑے ہوا کرو۔"

نماز ام الاعمال ہے، یعنی کئی اعمال کی بنیاد ہے۔ تقرب الٰہی کے تمام اعمال کا مرکز اور مجموعہ ہے، دین کی عمارت کا بنیادی ستون ہے، مومن کی معراج ہے، جو انسان کو تجلیات اخروی کے قابل بناتی ہے۔ نماز محبت الٰہی اور رحمت خداوندی کا عظیم ترین سبب بھی ہے۔ جب کوئی بندہ نماز کا دلدادہ ہو جاتا ہے تو رحمت الٰہی اسے ڈھانپ لیتی ہے۔ نماز گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بتلاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر نہر جاری ہو جس میں روزانہ پانچ دفعہ وہ نہاتا ہو تو کیا اس کے جسم پر کوئی میل باقی رہے گا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا بالکل یہی مثال پانچ نمازوں کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے خطاؤں کو دھوتے اور مٹاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

ہر مسلمان عاقل بالغ پر پانچ وقت روزانہ نماز پڑھنا فرض عین ہے، بلکہ سات سالہ بچے کو زبانی کہہ کر اور دس سالہ بچے کو مار کر عادی بنانے کیلئے نماز پڑھوانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث اور فقہ میں نماز کی بہت تاکید آئی ہے اور نماز چھوڑنے پر بہت وعید آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وقت پر نماز پڑھنا۔ (مشکوٰۃ شریف) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچوں وقت کی نمازیں اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعے تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک اپنے درمیان کے صغیرہ گناہوں کیلئے زائل کرنے والے ہیں بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے بچے۔ (مشکوٰۃ شریف) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "جو شخص نماز کی پابندی کرتا ہے نماز اس کیلئے قیامت کے دن روشنی کا سبب ایمان کی دلیل اور نجات کا ذریعہ ہوگی اور جس نے پابندی نہیں کی اس کیلئے نہ تو روشنی کا سبب ہوگی، نہ ایمان کی دلیل اور نہ نجات کا باعث اور وہ قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ جہنم میں ہوگا۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ حکومت میں حکام کو تحریری حکم نامہ بھیجا کہ میرے نزدیک تمہارے کاموں میں سے زیادہ ضروری نماز ہے۔ جو شخص اس پر پابندی اختیار کرے گا وہ دین کا پابند ہوگا اور جو شخص اس کو ضائع کرے گا وہ دوسرے امور کو زیادہ ضائع کرنے والا سمجھا جائے گا۔ (مشکوٰۃ شریف)

نماز کو چھوڑنا چاروں فقہاء کے نزدیک ایسا جرم ہے جس کی سزا بڑی سخت ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بے نمازی کو خوب مارا جائے اور ہمیشہ قید کیا جائے جب تک توبہ نہ کرے رہا نہ کیا جائے۔ باقی تینوں فقہاء فرماتے ہیں کہ بے نمازی قتل کر دیا جائے۔ فقہاء کرام کے یہ اقوال ان کے ذاتی نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ اس قدر سخت اقدام بتاتے ہیں کہ شریعت میں نماز کس قدر اہم عبادت ہے۔

جس طرح ہر کام کا فائدہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس کام کو ڈھنگ سے کیا جائے اسی طرح دینی کام بالخصوص نماز جیسی اہم عبادت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کے احکام و آداب سیکھ کر پورے اہتمام سے نماز پڑھی جائے تو اس کی برکت و نورانیت دنیا ہی میں نظر آ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہم سب کو نماز سیکھ کر سنت کے مطابق ادا کرنے کی توفیق سے نوازیں (آمین)

تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کرنے کی فضیلت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝

"اور اپنے رب کی طرف سے مغفرت اور وہ جنت حاصل کرنے کیلئے ایک دوسرے سے بڑھ کر تیزی دکھاؤ جس کی چوڑائی اتنی ہے کہ اس میں تمام آسمان اور زمین سما جائیں۔ وہ اُن پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔" (آل عمران۔۱۳۳)

اس آیت مبارکہ میں مغفرت، بخشش سے کیا مراد ہے؟ مختلف تفسیریں منقول ہیں۔ لیکن حضرت انس بن مالک اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما اس سے مراد تکبیرِ اولیٰ لیتے ہیں اب مطلب یہ ہوا کہ تکبیرِ اولیٰ کا اہتمام کرو۔ (تفسیر کبیر۔36413)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے چالیس دن تک تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کی، اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اس کیلئے دو قسم کی برأت (آزادیاں) لکھ دیتے ہیں۔ (۱) جہنم سے برأت (۲) نفاق سے برأت۔ (ترمذی) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ہر چیز کا ایک خلاصہ ہوا کرتا ہے اور ایمان کا خلاصہ نماز ہے اور نماز کا خلاصہ (قیمتی جوہر) تکبیرِ اولیٰ ہے۔ امام کے ساتھ تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھنا ایک ہزار اونٹ راہِ خدا میں صدقہ کرنے سے زیادہ افضل ہے۔ (کنز العمال 169/9)

بلاشبہ ہر چیز کی ایک ابتداء ہے اور نماز کی ابتدا تکبیرِ اولیٰ ہے۔ لہٰذا تم تکبیرِ اولیٰ کی پابندی کرو۔ تکبیرِ اولیٰ سے مراد (۱) جو پہلی رکعت میں مل گیا اس کو تکبیرِ اولیٰ کا ثواب مل جاتا ہے (فتاویٰ ہندیہ۔۱،۷۶) (۲) سورہ فاتحہ کے اختتام پر جو آمین کہی جاتی ہے اس میں شرکت سے بھی تکبیرِ اولیٰ کا ثواب مل جاتا ہے۔ (۳) امام کی قرأت شروع ہونے سے پہلے پہلے نماز میں شریک ہو جائے تو تکبیرِ اولیٰ میں شمار ہوگا۔ (۴) تکبیرِ اولیٰ سے مراد یہ ہے کہ امام جب پہلی مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دے تو مقتدی بھی اس وقت نماز میں شریک ہو جائے۔ علمائے امت کے عمل سے چوتھا قول راجح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جس نے امام کے ساتھ تکبیرِ تحریمہ میں شرکت کر لی وہ ان تمام اقوال پر عمل کرنے والا ہو گیا۔

دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ دستار بندی میں جب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تشریف لائے تو غالباً عصر کی نماز میں ایسا اتفاق پیش آیا کہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ نماز پڑھانے کیلئے مصلیٰ پر کھڑے ہوئے۔ مخلوق کے اژدحام اور مصافحہ کی کثرت کی وجہ سے باوجود جلدی کے جس وقت آپ نماز میں شریک ہوئے تو تکبیرِ اولیٰ ہو چکی تھی۔ سلام پھیرنے کے بعد دیکھا گیا تو آپ اداس تھے۔ چہرہ بجھا بجھا سا تھا اور آپ نے رنجیدہ ہو کر فرمایا کہ افسوس! بائیس برس کے بعد آج تکبیرِ اولیٰ فوت ہو گئی۔ حضرت وکیع بن الجراح رحمہ اللہ نے حضرت اعمش رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ان کی عمر تقریباً ستر سال تھی اور اس ستر سالہ دورِ زندگی میں کبھی ان کی تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی تھی۔

آدمی کے نزدیک جس چیز کی قدر و قیمت ہوتی ہے وہ اسی میں مشغول ہوتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے پر وہ خوش ہوتا ہے اور اس کے فوت ہونے پر وہ غم زدہ ہوتا ہے۔ ہمارے اکابر اسلاف کے نزدیک دین اور آخرت کے اعمال ہی سب کچھ تھے، اسی کو پا کر وہ خوش ہوتے اور فوت ہونے پر یا تاخیر ہونے پر غم زدہ ہوتے تھے۔ جب کہ ہماری جماعت فوت ہو جائے یا کچھ رکعات نکل جائیں تو ہمیں افسوس تک نہیں ہوتا۔ جب کہ ہمارے اسلاف ایک تکبیرِ اولیٰ فوت ہونے پر تین دن اور جماعت فوت ہونے پر سات دن غم زدہ رہتے تھے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں تکبیرِ اولیٰ کا اہتمام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سارے دین کا خلاصہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ . (الاحزاب۔۲۱)

"حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے ۔"

شیخ ابوعبداللہ ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں ان سے ایک مرتبہ لوگوں نے سوال کیا کہ دین اسلام کے اصول فروع کیا ہیں؟ آپ نے نہایت جامعیت کے ساتھ چند جملوں میں سارے دین کا خلاصہ بیان فرمادیا۔ آپ نے فرمایا دین کے اصول دو ہیں:

پہلا اصول: صِدْقُ الْاِفْتِقَادِ اِلَی اللّٰہِ ۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف مخلصانہ احتیاج۔ اس جملہ میں واحدانیت کے تمام پہلو آگئے اور شرک کے ہر شائبہ سے اجتناب کا اعلان ہوگیا کہ آدمی کو ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ ہی کا محتاج رہنا چاہیئے۔ غیر اللہ پر بھروسہ کرنا اس کے سامنے دامن پھیلانا، منتیں مانگنا اور چڑھاوے چڑھانا یہ سب اصول دین کے خلاف ہے

دوسرا اصول: حُسْنُ الْاِقْتِدَاءِ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ ۔ یعنی ہر مسلمان رسول اکرم ﷺ کی شاندار اقتدا اور اتباع کی کوشش کرے اور اپنے ظاہر و باطن، لباس، گفتار، رفتار، ہر چیز کو پیغمبر ﷺ کی سنت کے مطابق بنائے۔ اگر اس کے خلاف کرے گا تو دینی اصول کی خلاف ورزی کرنے والا ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے بہترین نمونہ بتلایا ہے جو شخص اس نمونہ سے جتنا زیادہ مشابہ ہوگا، اتنا ہی اپنے رب کا پسندیدہ ہوگا اور جو اس نمونہ سے جتنا مخالف ہوگا اگرچہ وہ اپنے کو کتنا ہی اچھا سمجھتا ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناپسند ہی رہے گا۔

شیخ ابوعبداللہ نے پھر آگے فرمایا کہ دین کے فروع یعنی جزئی احکام کا خلاصہ کل چار باتیں ہیں۔ جو ان باتوں کا اہتمام کرے وہ دین کے تمام جزئی احکامات پر عمل کرنے والا ہوجائے گا۔

(۱) اَلْوَفَاءُ بِالْعُھُوْدِ : یعنی اللہ نے بندے سے جو عہد لیا ہے اس کی پاسداری کرنا تمام فرائض وواجبات اور حقوق کی ادائیگی یہ سب ایفائے عہد میں داخل ہیں۔ (۲) وَحِفْظُ الْحُدُوْدِ : اور تمام حدود وموانع کی حفاظت کرنا یعنی ہر گناہ سے اپنے آپ کو بچانا، حرام اور مشتبہ چیزوں سے اجتناب کرنا اور ہر معاملہ میں اعتدال کو اختیار کرنا۔

(۳) وَالرِّضَآءُ بِالْمَوْجُوْدِ : اور جو دنیاوی ساز وسامان اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس پر راضی رہنا اور شکر بجالانا۔ یہ نہیں کہ پس زیادتی ہی کی فکر رہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے اگر آدمی دنیاوی معاملات میں اپنے سے نیچے پر نظر رکھے تو اس کے دل میں شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس لئے جو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے پس اس پر دل سے راضی رہنا چاہیئے، زیادہ کی طرف نظر کر کے ناشکری نہیں کرنی چاہیئے۔

(۴) وَ الصَّبْرُ عَلَی الْمَفْقُوْدِ : اور جو نعمت جاتی رہی اس پر صبر کرنا۔ یہ صبر بجائے خود مومنین کیلئے رحمت ہے۔ قرآن کریم میں جا بجا صبر کرنے والوں سے بے حساب اجر کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے ایک شخص کو دیکھا جس کی دکان میں آگ لگنے کی وجہ سے بہت سامان ضائع ہوگیا تھا اور وہ اس حادثے کی وجہ سے دیوانہ سا ہوگیا تھا اور ہائے واویلا مچا رہا تھا۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے اسے سمجھایا، ارے اللہ کے بندے! یہ مال اللہ تعالیٰ کا ہے وہ جب تک چاہے اس سے تجھے فائدہ پہنچائے اور جب چاہے تجھ سے لے لے۔ اس لئے اس کے فیصلے پر صبر کرو اور شور نہ مچاؤ اور عافیت پر شکر میں سے یہ بات ہے کہ مصیبت پر آدمی صبر کرے۔ اور جو نیکی آگے پہنچادے گا وہ اسے آخرت میں پائے گا۔ اور جو نہیں پہنچائے گا اسے آخرت میں کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ (شعب الایمان للبیہقی) اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عمل سے نوازے۔ (آمین)

اتحادِ امت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص (آل عمران:۱۰۳)

"اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو، اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔"

اس اتحاد کی ضرورت اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے بہتر کون جانتا ہے، اس کے بغیر امت مسلمہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح نااتفاقی کا شکار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی اور پھر قدرت کا منشا تشنۂ تکمیل رہ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ مسلمان دنیا کی بہترین امت ہوں، اچھائی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔ دینِ اسلام کا پیغام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں اور دینِ اسلام کو غالب بنانے کی کوشش کریں اور خود بھی غالب رہیں۔ گویا برتری اور غلبہ حاصل کرنا، جو انسان کی ایک فطری تمنا کہی جا سکتی ہے اسی وقت ممکن ہے جب ساری امت مسلمہ کے تمام افراد میں ایسا اتحاد قائم رہے جو انہیں ایک دوسرے سے مربوط رکھیں، ایک دوسرے کا جانثار اور ہمدرد بنائے اور ایسی شیرازہ بندی قائم کر دے، کہ بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے اور وہ کامیابی کے ساتھ دینِ اسلام کو تمام دوسرے طریقہ ہائے زندگی اور افکار و اعمال کے تمام نظاموں پر غالب کر سکیں۔ امت مسلمہ کو جو فرائض و ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں ان پر اس وقت تک عمل نہیں ہو سکتا جب تک پوری امت ایک ناقابلِ شکست وحدت کی طرح اور افراد، امت باہم دگر شیر و شکر نہ ہوں۔

اسلام کا منشا یہ ہے کہ مسلمان خود اسلامی تعلیم کا نمونہ بن کر رہیں اور آپس میں اس طرح متحد ہو کر رہیں کہ دوسرے لوگ یہ محسوس کریں کہ مسلمان بحیثیت امت ایک منفرد اور قابلِ تقلید قوم ہیں۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ مسلمان آپس میں اس طرح ایک دوسرے سے منسلک رہیں جس طرح دیوار کی اینٹیں ایک دوسرے کو سہارا دیئے رہتی ہیں۔ اور یہ سب مل کر خود کو ایک مضبوط اور مستحکم دیوار کی حیثیت سے قائم رکھتی ہیں۔ مسلمان بھی آپس میں ایک دوسرے کا سہارا بن کر رہیں گے تو ایک ناقابلِ تسخیر امت کی حیثیت سے اس دنیا میں عزت اور اقتدار کے ساتھ زندہ رہیں گے۔ اس اتحادِ امت پر زور دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ (الحجرات۔۱۰) ان کا نفع مشترک اور ان کا نقصان ایک ہے، ان کی طاقت ان کا اتحاد ایک ہے ان کی برتری دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں اس لئے بھی ہوگی کہ مسلمان امت کی برتری اور فلاح کیلئے کوشش کرتا ہے اور اتحاد و اتفاق کو قائم رکھنے کیلئے بڑی سے بڑی انفرادی قربانی پیش کرتا ہے۔

لیکن ہم اپنی جس بدحالی پر پریشان ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ملت کے جسم کو اپنی خود غرضیوں اور ذاتی مفاد پرستیوں سے کمزور کیا ہے اور نقصان پہنچایا ہے۔ ہم مسلمانوں کا انفرادی وجود درحقیقت ہمارے ملی وجود کا پرتو اور اس کا سایہ ہے۔ جب ہماری ان حرکتوں سے ہمارے سروں پر سایہ کرنے والا یہ وجود کمزور ہو گیا تو ہم کیسے خوشحال رہ سکتے ہیں۔ اگر ہمیں بحیثیت فرد کے ترقی کرنی ہے تو ہمیں اپنے اندر اور اپنی صفوں میں وہ اتحاد و اتفاق پیدا کرنا ہوگا جس کا ہمارے خالق نے حکم دیا ہے اور جس کی طرف آنے کی دعوت ہمیں قرآن دیتا ہے۔ اور جس کی سمت چلنے اور بڑھنے کی ہدایت ہمیں ہمارے رسول ﷺ نے دی ہے۔ یاد رکھیں ہماری فلاح اتحاد و اتفاق ہی میں ہے۔

ایک مسلمان کو کیسے رہنا چاہیئے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص (آل عمران:۱۰۳)

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا ارشاد ہے: ''اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو، اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔''

☆ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تم میں سے پہلی امتوں کی بیماری تمہارے اندر سرایت کر گئی وہ بیماری حسد اور بغض ہے جو مونڈ دینے والی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ دین کا صفایا کر دیتی ہے۔'' (کہ اس بیماری کی وجہ سے انسان کے اخلاق تباہ و برباد ہو جاتے ہیں) (ترمذی)

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''شیطان اس بات سے تو مایوس ہو گیا کہ جزیرۂ عرب میں مسلمان اس کی پرستش کریں، یعنی کفر و شرک کریں۔ لیکن ان کے درمیان فتنہ و فساد پھیلانے اور ان کو آپس میں بھڑکانے سے مایوس نہیں ہوا۔ (مسلم)

☆ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے تعلق ایک عمارت کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالیں (اور اس عمل سے یہ سمجھایا کہ مسلمانوں کو اسی طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہنا چاہیئے اور ایک دوسرے کی قوت کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔) (بخاری)

☆ نبی کریم ﷺ ارشاد فرمایا کرتے تھے: ''قسم ہے اس ذات عالی کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے والے دو مسلمانوں میں پھوٹ پڑنے کی وجہ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہوتی کہ ان میں سے کسی ایک سے گناہ سرزد ہو جائے۔ (مسند احمد)

☆ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کیلئے جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے (قطع تعلق کر کے) اسے تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے۔ لہٰذا اگر تین دن گذر جائیں تو اپنے بھائی سے مل کر سلام کر لینا چاہیئے۔ اگر اس نے سلام کا جواب دے دیا تو اجر و ثواب میں دونوں شریک ہو گئے اور اگر سلام کا جواب نہ دیا تو وہ گناہ گار ہوا اور سلام کرنے والا قطع تعلق (کے گناہ) سے نکل گیا۔ (ابوداؤد)

☆ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''آپس میں مصافحہ کیا کرو (اس سے) کینہ ختم ہو جاتا ہے، آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو باہم محبت پیدا ہوتی ہے اور دشمنی دور ہوتی ہے۔ (موطاء مالک)

مذکورہ بالا احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سب مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق سے رہنا چاہیئے، ہر سطح پر اپنے اختلافات کو بھلا کر باہم شیر و شکر ہو جانا چاہیئے۔ باہمی اتحاد و اتفاق سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ برکات کا نزول بھی ہوتا ہے اور دشمن کی میلی نظروں سے بچت بھی ہو جاتی ہے۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہم سب کو فتنہ و فساد سے محفوظ فرمائیں اور اتفاق و اتحاد کی دولت نصیب فرمائیں۔ (آمین ثم آمین)

مسلمانوں کے زوال کا سبب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اختلاف بڑی منحوس اور مذموم چیز ہے۔ آج دینی و دنیاوی ہر حیثیت سے مسلمانوں کی پستی اور بربادی کے اسباب پر غور کیا جائے تو اکثر مصائب کا سبب یہی آپس کے اختلاف اور تشتت (گالی گلوچ) نظر آئے گا۔ ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں یہ عذاب ہم پر مسلط ہو گیا کہ وہ قوم جس کے اتحاد و اتفاق کا مرکز ایک کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" تھا اس کلمہ کا ماننے والا زمین کے کسی حصہ میں ہو، کسی زبان کا بولنے والا ہو، کسی رنگ کا ہو، کسی نسل و نسب سے متعلق ہو سب بھائی بھائی تھے۔ کوہ و دریا کی دشوار گزار منزلیں ان کی وحدت (یگانگی) میں حائل نہ تھی، نسب و خاندان، رنگ و زبان کا فرق ان کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا۔ ان کی قومی وحدت صرف اس کلمہ سے وابستہ تھی۔ عربی، مصری، شامی، ترکی، ہندی، چینی کی تقسیم صرف اور صرف شناخت اور تعارف کیلئے تھی اور کچھ نہیں۔ بقول اقبال مرحوم۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

آج دوسری قوموں کی سازشوں اور مسلسل کوششوں نے پھر ان کو نسلی، لسانی اور وطنی قومیتوں میں بانٹ دیا اور پھر ان میں سے ہر ایک قوم و جماعت اپنے اندر بھی انتشار کا شکار ہو کر مختلف پارٹیوں میں بٹ گئی۔ وہ قوم جس کا شعار غیروں سے بھی عفو و درگذر اور ایثار کا تھا اور جھگڑے سے بچنے کیلئے اپنے بڑے سے بڑے حق کو چھوڑ دیتی تھی آج اس کے بہت سے افراد ذرا ذرا سی حقیر و ذلیل خواہشات کے پیچھے بڑے سے بڑے تعلق کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہی وہ اغراض و خواہشات کا اختلاف ہے جو قوم و ملت اور اس دنیا میں نقد عذاب ہے۔

ہاں! اس جگہ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ وہ اختلاف جس کو قرآن میں عذاب الٰہی اور رحمت خداوندی سے محرومی فرمایا گیا ہے، یہ وہ اختلاف ہے جو اصول و عقائد میں ہو یا نفسانی اغراض و خواہشات کی وجہ سے، اس میں وہ اختلافِ رائے داخل نہیں جو قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے اصولی اجتہاد کے ماتحت فروعی مسائل میں فقہائے امت کے اندر قرنِ اول سے صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم میں ہوتا چلا آیا ہے۔ جس میں فریقین کی محبت قرآن و سنت اور اجماع سے ہے اور ہر ایک کی نیت قرآن و سنت کے احکام کی تعمیل ہے۔

اس اجتہادی اختلاف کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے شہر کی بڑی سڑکوں کو چلنے والوں کی آسانی کیلئے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک حصہ پر بسیں چلتی ہیں دوسرے پر دوسری گاڑیاں، اسی طرح سائیکل سوار اور پیدل چلنے والوں کیلئے سڑک کا ایک علیحدہ حصہ ہوتا ہے۔ ایک سڑک کی کئی حصوں میں یہ تقسیم بھی اگرچہ ظاہری طور پر ایک اختلاف کی صورت ہے مگر چونکہ سب کا رخ ایک سمت ہے اور ہر ایک ایک ہی راستہ پر چلنے والا ایک ہی منزل مقصود پر پہنچے گا۔ اس لئے راستوں کا یہ اختلاف بجائے نقصان دہ ہونے کے مفید اور چلنے والوں کیلئے وسعت اور رحمت ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہم سب کو اختلافات بھلا کر مل جل کر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

خیر میں تعاون رضائے الٰہی کا وسیلہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ص (المائدہ۔۲) ”اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔“

امن وسکون کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ تمام لوگ ایک دوسرے سے محبت کریں، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور مساوات کا سلوک کریں، ایک دوسرے کا خیر کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آئیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر معاملے میں انسان بلا امتیاز ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائے؟ اسلامی شریعت اس قسم کے بے مقصد اور ضرر رساں تعاون کی قائل نہیں ہے۔ اسلام انسانوں کو حکم دیتا ہے کہ پرسکون معاشرہ قائم کرنے کیلئے صرف خیر نیکی اور بھلائیوں کے کاموں میں ہی تعاون اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ برے کاموں میں اللہ کی معصیت میں اور ابنائے جنس کو نقصان پہنچانے میں ہرگز تعاون نہ کیا جائے۔ یعنی تعاون اور اشتراک خیر اور حسن عمل کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ برے کاموں میں کسی کی معاونت صرف گناہ ہی نہیں ہے بلکہ نیکیوں کے ساتھ ظلم وزیادتی ہے۔ اس لئے کہ برائیوں کی حوصلہ افزائی سے نیکی مقہور ومغلوب ہوتی ہے اور انسان دوہرے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ تقویٰ اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ہرگز تعاون نہ کرو۔ اس طرح اسلام نے تمام حق پرست انسانوں کو تعاون کا پیمانہ عطا کر دیا اور یہ بتا دیا کہ نیکی اور خیر میں تعاون رضائے الٰہی کا وسیلہ ہے اور فطرتِ الٰہی کے عین مطابق ہے۔ اس کے مقابلے میں شر اور برائی میں تعاون اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی ناراضگی اور فطرتِ الٰہی کی بدترین خلاف ورزی ہے۔

آنحضرت ﷺ کا بہت ہی مشہور فرمان ہے کہ اپنے بھائیوں کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہوں یا مظلوم! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا کہ مظلوموں کی حمایت کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم کی حمایت..... جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ظالموں کی حمایت یہ ہے کہ انہیں ظلم سے روکا جائے، نصرت اور اعانت کا یہی مطلب ہے کہ ظلم سے باز رکھا جائے جو عتابِ الٰہی اور عذابِ جہنم سے بچانے کا موجب ہوگا۔ اس سے بڑھ کر کسی کے ساتھ تعاون کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی عاقبت سنوار دی جائے۔

تعاون علی الخیر ہر حال میں ضروری ہے۔ ظالم اگر اپنا بھائی بھی ہو تو بھی اس کے ظلم کی حمایت اسلامی شریعت میں جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام میں تعاون کی شرط خیر کے ساتھ وابستہ ہے۔

اس لئے تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ تعاون صرف اچھے کاموں میں کریں، اس نقطۂ نظر سے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ اور صدقات اور امداد کی رقوم یتیم خانوں، درس گاہوں اور دوسرے خیر کے کاموں میں لگانے کی بجائے پیشہ ور سائلوں کو دیتے ہیں کیا وہ تعاون علی الخیر کر رہے ہیں یا پیشہ ورانہ گداگری کو فروغ دے رہے ہیں؟ یہ بات اصولی طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ برے کام میں ہرگز تعاون نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ان کی حوصلہ شکنی کرنی ہے تاکہ مفاسد کا قلع قمع ہو سکے۔ اللہ رب العزت عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

اجتماعی فلاح

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ص (المائدہ۔۲) ''اور گناہ اور ظلم میں تعاون نہ کرو۔''

اسلام دین فطرت ہے اس نے معاشرتی بہبود اور اجتماعی فلاح کے جو اہم اصول بتائے ہیں اگر ان پر کسی معاشرے کو استوار کیا جائے تو ہم فطرت سے بہت قریب ہو سکتے ہیں۔ اور ان فیوض و برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں جو فطرت سے قرب کا ثمر ہوتے ہیں۔ اجتماعی فلاح کا ایک اہم اصول جو قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے، یہ ہے کہ ہر اچھے کام میں ہر نیکی اور ہر بھلائی میں تعاون کرو۔ ایک دوسرے کی مدد کرو اور کسی برے کام، کسی بگاڑ میں کسی تخریب میں، کسی گناہ میں تعاون نہ کرو۔ باہمی تعاون صرف خیر میں فرض ہے، شر اور بدی میں تعاون نہ کرنا ضروری ہے۔ بدی میں تعاون کیا جائے تو وہ خود بدی کرنے کے برابر ہے۔ قرآن حکیم کے مذکورہ چند الفاظ میں دونوں جہانوں کی راحت پوشیدہ ہے۔ جب بدی کو کسی معاشرے میں پنپنے کا موقع نہ ملے تو وہ معاشرہ سراسر خیر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ کوئی فرد اگر کوئی غلط کام کرنا چاہے تو وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو کسی کا تعاون حاصل نہ ہو، جب تک حوصلہ افزائی نہ ہو۔ اس سے یہ بات بالکل ظاہر اور ثابت ہو جاتی ہے کہ خیر ہو یا شر نیکی ہو یا بدی، اس کی کامیابی اس کی وسعت اسی وقت ممکن ہے جب اس کو حمایت و تعاون حاصل ہو ۔ جب اس میں شرکت ہو، تنِ تنہا کوئی فرد غلط کام اگر کر بھی لے گا تو وہ معاشرے کے عتاب سے اور عقوبت سے نہیں بچ سکے گا۔ گویا تعاون اور امداد باہمی وہ عمل ہے جو اجتماعی خسران یا اجتماعی فلاح دونوں میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن حکیم نے اس لئے واضح الفاظ میں نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون کرنے کا حکم دیا ہے اور بدی اور برائی کے کاموں میں تعاون نہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔

یہاں میں ذرا اس نکتے کو مزید واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن حکیم نے یہ نہیں فرمایا کہ بدی میں تعاون کرنا ضروری نہیں ہے۔ یعنی چاہے تعاون کرو چاہے نہ کرو بلکہ وہ حکم دیتا ہے کہ برائی میں تعاون نہ کرو۔ یعنی تعاون نہ کرنا مسلمان کا فرض ہے اور تعاون کرنا گناہ ہے۔

اجتماعی فلاح اس امر پر منحصر ہے کہ کسی سوسائٹی کے تمام ارکان و افراد یک دل اور یک خیال اور یک سو ہو کر اعلیٰ اقدار کی کامیابی کیلئے کام کریں اور وہ جہاں جس شکل میں اور جس وقت بھی خیر و سعادت کے کاموں کو ہوتا دیکھیں، اس میں تعاون کیلئے آگے بڑھیں اور ہر طریقہ سے اچھے کام کرنے والوں کی مدد، حمایت اور ہمت افزائی کریں۔ جس سوسائٹی یا جس معاشرے میں نیکی اور نیک کی قدر کی جاتی ہے، علم و عالم کی تکریم کی جاتی ہے اس معاشرے میں قدرتی طور پر یہی چیزیں فروغ پائیں گی۔ یعنی لوگ نیک بننے کی کوشش کریں گے۔ علم حاصل کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کریں گے اور پھر لازمی طور پر اس معاشرے میں امن و راحت کا دور دورہ ہوگا، ترقی و تعمیر کیلئے ہر شخص کوشاں ہوگا۔ باہمی اعتماد و خوشدلی کی فضا ہوگی، ہر ایک کی خوشحالی اور شادمانی کیلئے کام کئے جائیں گے۔ معلوم ہے کہ یہ کون سا معاشرہ ہوگا؟ ایسا معاشرہ صرف اور صرف اسلامی معاشرہ ہوگا۔

امن وسلامتی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَّاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ (سورۃ القریش۔۴) ''اور بدامنی سے اُنہیں محفوظ رکھا۔''

روئے زمین پر استقرار کے بعد نوع انسانی کا سب سے بڑا مسئلہ امن وسلامتی کو یقینی بنانا ہے۔ لیکن جس طرح فرشِ زمین پر انسانوں کی بودوباش کو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہی نے آسان بنایا۔ اس طرح انسانی معاشرے کو خوف وہراس سے پاک کر کے پر امن زندگی گذارنے کی ہدایت بھی اس کی بارگاہ سے نصیب ہوئی۔ اگر معاشرے سے امن کی صورت ختم ہو جائے اور فساد اس کی جگہ لے لے تو انسان کو انفرادی یا اجتماعی کسی فرض کی ادائی کا موقع نہیں مل سکتا۔ اس لئے امن کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی نعمت قرار دیا ہے۔

اس لئے زندگی کے پہلے سانس کے ساتھ ساتھ گہوارۂ امن ضروری ہے ورنہ حیات کے وسیع تر تقاضوں کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔

دنیا میں اسی امن وسلامتی کو یقینی بنانے کیلئے اور فتنہ وفساد، جنگ، جدال، باہمی خونریزی اور معرکہ آرائی تشدد اور جبر واستبداد، ظلم، دھونس، دھمکی اور انسانوں پر انسانوں کی خدائی کو ختم کرنے کیلئے ہی انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت ہوتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف سے وہ جو پیام لے کر آتے رہے ہیں اور جو دعوت پیش کرتے رہے ہیں، اس دعوت کا نام ہی ایمان ہے۔ بلاشبہ اس لفظ کے متعدد مآخذ کی طرف مفسرین نے اشارے کئے ہیں، مگر جمہور کا اتفاق ہے کہ ایمان کی اصل امن ہی ہے۔ ایمان، امن اس لئے ہے کہ ایک آدمی اللہ اور رسول پر اپنے پختہ یقین کا اظہار کر کے آخرت کے عذاب سے مامون رہتا ہے۔ اور دنیا میں بھی انتشار وفساد کو خلاف ایمان سمجھ کر تشدد، خونریزی اور جنگ وجدال سے دور رہتا ہے۔ اور جب معاشرہ اللہ پر یقین، انبیاء اور کتب سماویہ پر اذعان وعمل کے ستونوں پر قائم ہو جاتا ہے تو زمین سے فساد کا مکمل ازالہ ہو جاتا ہے اور اس فرشِ خاکی پر حیات صرف ایک نعمت ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی عظیم الشان نعمت معلوم ہونے لگتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ قوم جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا کر دنیا میں قیام امن کی پوری پوری ذمہ داری قبول کر لیتی ہے، اس کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیئے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کبھی کوئی تصادم نہ ہو، یہ بات بھی بالکل منطقی ہے کہ کبھی کبھی کوئی اختلاف ہو جائے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اختلاف الگ چیز ہے اور نقضِ امن الگ چیز ہے۔ ان دونوں کی حدود مقرر ہیں۔ بلاشبہ تصادم کا ایک موقع وہ بھی آتا ہے جب اسلام اور کفر آمنے سامنے ہوتے ہیں، پھر تو سر دھڑ کی بازی لگا دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اہلِ اسلام وسیع تر امن کے قیام کیلئے ایسا کرتے ہیں اور اہل کفر دنیا میں باطل کے غلبے کیلئے کرتے ہیں جو سراسر فتنہ وفساد ہے۔ تاہم تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جنگ سے امکانی طور پر احتراز ہی فرمایا اور صلح کو ترجیح دی۔ گفت وشنید اور مذاکرات کا طریقہ اختیار فرمایا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ امن وسلامتی، جنگ وجدال پر اس درجہ مقدم ہے کہ اس خدشے کے باوجود کہ دشمن کا مقصود فریب دہی ہو۔ تم اپنی طرف سے صلح کی پیشکش کو نہ ٹھکراؤ۔ اس لئے کہ امت مسلمہ امن وعدل ہی کے قیام کیلئے وجود میں آئی ہے اور اللہ کے رسول ﷺ پر یقین رکھنے والے کو امن پسندی اور امن آفرینی ہی کی وجہ سے مومن کہا گیا ہے۔ اللہ ہمیں بھی باعمل مسلمان بنا دیں۔ (آمین)

آپس میں جھگڑا نہ کرو

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَلَا تَنَازَعُوْا (الانفال۔۴۶) ''اور آپس میں نہ جھگڑو''

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے تمام انسانوں کو ایک کنبہ بن کر زندگی گذارنے کی تاکید کی ہے۔ مسلمان تو باہم بھائی چارے سے رہتے ہی ہیں لیکن غیر مسلم سے بھی ناحق لڑنے جھگڑنے سے منع کیا گیا ہے۔ دنیا کی یہ زندگی قلیل ہے، ایک مسلمان کو اعمال آخرت سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں خود کو الجھائے اور لوگوں سے لڑتا جھگڑتا رہے۔

حدیث شریف میں بڑی عجیب دعا سکھائی گئی ہے: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا .

''کہ اے اللہ مجھے میری نگاہوں میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنا دیجئے۔''

جب آدمی خود کو چھوٹا سمجھے گا تو دوسروں کو خود سے بڑا سمجھ کر ان کا ادب واحترام کرے گا۔ جب لوگوں کی نظر میں بڑا ہوگا تو وہ اس کی عزت کریں گے۔

لڑائی کا ایک عام سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی خود اپنے بارہ میں ایک عزت وتکریم کا معیار مقرر کر لیتا ہے۔ جب دوسرے لوگ اس معیار سے ہٹ کر معاملہ کرتے ہیں تو آدمی لڑائی جھگڑے پر اتر آتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ لڑائی جھگڑے دین کو مونڈھنے والے ہیں۔ لڑائی کی نحوست سے خود آدمی کی عزت بھی متاثر ہوتی ہے اور اپنی زندگی کے سکون وراحت کو بھی خراب کرتا ہے۔

آدمی کی عقلمندی اسی میں ہے کہ وہ ہر معاملہ میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے تاکہ بعد میں کسی قسم کی غلط فہمی یا لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آئے۔ قرآن کریم میں جھگڑالو آدمی کی بہت مذمت کی گئی ہے اور اس کے برخلاف حلم وبردباری اور جھگڑے سے پرہیز کو پسند فرمایا گیا ہے۔ جھگڑے سے بچنے پر خود اپنا فائدہ ہے۔ لیکن شریعت کی مہربانی دیکھئے کہ انہوں نے اس کام کو بھی باعث اجر قرار دیا کہ جھگڑے سے بچنے پر کس قدر عظیم بشارت سے نوازا۔ حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''میں اس شخص کو جنت کے کناروں پر گھر دلوانے کی ضمانت دیتا ہوں جو جھگڑا چھوڑ دے، خواہ وہ حق پر ہو۔''

پس جھگڑا چھوڑنے کا اجر اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ حضور ﷺ جنت میں گھر دلوانے کی ضمانت دے رہے ہیں، جھگڑے کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم دوسروں پر اعتماد کر کے معاملہ کر لیتے ہیں اور شرعی وقانونی تقاضوں کے مطابق تحریری کارروائی نہیں کرتے۔ اس مبہم معاملہ میں جب فریق ثانی بداعتمادی کرتا ہے تو اس وقت ہوش آتا ہے، اور لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے دوسرے شخص کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ شاید تم نے اسے مسجد سے نکلتا ہوا دیکھا ہوگا۔ یعنی جب تک کسی شخص سے معاملہ، سفر یا لین دین نہ کر چکے ہوں اس وقت تک کسی شخص کے بارہ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شریعت میں جھگڑوں سے بچنے کا کس قدر اہتمام ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مجبوری کی حالت میں خنزیر وشراب جیسی چیزیں بھی چند لمحوں کیلئے حلال ہو جاتی ہیں جب کہ جان کے لالے پڑ جائیں۔ لیکن جھگڑا جو کہ ایک فتنہ ہے اس کو شریعت نے کسی بھی صورت میں جائز قرار نہیں دیا۔

آخرت کی تیاری

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ (الحشر ۔۱۹)

''اور تم اُن جیسے نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول بیٹھے تھے، تو اللہ نے اُنہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

موجودہ دور کی حواس باختگی اس چیز کی واضح علامت ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کو بھول بیٹھے ہیں، جس کی پاداش میں ہم خود اپنی ذات سے بھی بے گانہ ہو چکے ہیں۔ دنیا کے تفکرات کو خود پر اس قدر سوار کر لیا ہے کہ فکرِ آخرت کا خانہ ہی نہیں ہے۔ ہماری اکثریت اس طرز کی زندگی گزار رہی ہے کہ گویا انہوں نے مرنا ہی نہیں ہے۔ آج کی مصروف زندگی پر نظر دوڑائیے اور خود کو مخاطب کیجئے کہ دنیا میں کسی معمولی سفر پر جانا ہو تو اس کیلئے کس طرح انتظامات کئے جاتے ہیں۔ جب کہ اس چند روزہ سفر سے بعافیت واپسی کی امید بھی ہوتی ہے۔ جب کہ آخرت کا سفر درپیش ہے، لیکن کس دن کس وقت کوچ کرنا ہے؟ یہ بات صرف اللہ عالم الغیب کو معلوم ہے، یہ ایسا سفر ہے جس سے واپسی بھی نہیں۔

ہم نے خود کو اس سفر کیلئے کس قدر تیار کیا ہے، ہماری شب و روز کی محنت صرف اور صرف دنیا اور اس کے معاملات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ دنیا میں خود کو اس قدر منہمک کر چکے ہیں کہ آخرت اور ذکرِ آخرت سے وحشت ہونے لگتی ہے، ایسا کیوں ہے؟

اس لئے ہم نے آنکھوں سے نظر آنے والی دنیا اور اس کے مال و متاع پر خود کو راضی کر لیا ہے اور وہ آخرت جس کے بارے میں قرآن و حدیث میں بتایا گیا ہے اس سے آنکھیں بند کر لیں۔ جب موت کا پنجہ ہمیں گرفت میں لے گا تو اس وقت آنکھیں کھلیں گی کہ ہم نے کیا کرنا تھا اور کیا کر چلے۔ لیکن اس وقت کی حسرت کام نہ آئے گی۔

حالانکہ دنیا کی ایک لمحہ کی خبر نہیں لیکن اس کیلئے ہم نے دن رات ایک کیا ہوا ہے۔ روزانہ اپنے عزیز و اقارب کو اپنے سامنے انتقال کرتا دیکھتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں انہیں غسل دیتے ہیں، خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتے ہیں اور خود انہیں قبر میں اتارتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود ہم یہی سمجھتے ہیں کہ موت نے صرف دوسروں کا گھر دیکھا ہے جبکہ ہم موت سے مامون و محفوظ ہیں۔

دنیا فانی اور آخرت باقی ہے۔ دنیا کی ہر خوشی غم سے ملی ہوئی ہے۔ یہاں کا غم بھی ناپائیدار ہے اور خوشی بھی وقتی ہے۔ جبکہ آخرت کی زندگی نہ ختم ہونے والی ہے یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا کوئی بھی مسلمان انکار نہیں کر سکتا اور موت کے بارے میں تو کسی مسلم و غیر مسلم کا اختلاف ہی نہیں کہ وہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

ذرا سوچئے! آخرت جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی جگہ ہے، جو ہمارے بنیادی عقائد کا اہم جزو ہے کہ آخرت پر ایمان کے بغیر کوئی مسلمان نہیں رہ سکتا۔ کیا اس کا تقاضا اس قدر بھی نہیں کہ ہم جتنی کوشش دنیا کیلئے کر رہے ہیں، کم از کم اتنی کوشش آخرت اور اس کی تیاری کیلئے ہی کر لیں۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہم سب کو موت سے پہلے مرنے کی تیاری اور فکرِ آخرت نصیب فرمائے۔ (آمین)

صبر کے مواقع

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (البقرہ۔۱۵۳) ”بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

حدیث شریف میں ہے کہ صبر نصف ایمان ہے۔

انسان کے اندر دو قوتیں ہیں ایک دین پر ابھارتی ہے اور دوسری خواہش نفسانی کو ابھارتی ہے۔

پہلی قوت کو دوسری قوت پر غالب کر دینے کا نام صبر ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانیہ کے تقاضوں پر عمل نہ کرے، ذکر اللہ، صحبت اہل اللہ، موت و قبر و دوزخ کے مراقبہ سے صبر کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

نفس کو دین کی بات پر پابند رکھنا اور دین کے خلاف اس سے کام نہ ہونے دینا اس کو صبر کہتے ہیں۔ اگر مالدار ہے تو ایسے دولت والوں کیلئے صبر یہ ہے کہ دماغ خراب نہ ہو۔ خدائے تعالیٰ کو نہ بھول جائیں۔ موت اور قبر کی بے کسی کا دھیان رکھیں، غریبوں کو حقیر نہ سمجھیں، ان کے ساتھ نرمی و احسان کریں۔

دوسرا موقع صبر کا یہ ہے کہ عبادت کے وقت سستی نہ آنے دیں، خواہ نماز ہو یا زکوٰۃ دینا ہو ایسے موقع پر صبر تین طرح کا ضروری ہے۔

(۱) عبادت سے پہلے نیت درست کرے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے کرتا ہوں۔ نفس کی کوئی غرض شامل نہ ہو۔

(۲) عبادت کے وقت کم ہمتی نہ کرے، خوب ہمت سے دل لگا کر سنت کے مطابق عبادت کرے اور دل کو بھی حاضر رکھنے کا اہتمام کرے۔

(۳) عبادت کے بعد کسی کے سامنے اپنی عبادت کو کہتا نہ پھرے۔

تیسرا موقع: صبر کا گناہ کے تقاضے کے وقت کا ہے۔ اس وقت صبر یہ ہے کہ نفس کو گناہ سے روکے۔

چوتھا موقع: صبر کا یہ ہے کہ جب کوئی مخلوق میں سے تکلیف دے، برا بھلا کہے اس وقت صبر یہ ہے کہ بدلہ نہ لے، خاموش رہے اور یہ خیال کرے کہ ہم آج کی خطا معاف کر دیں گے تو کل حق تعالیٰ جل شانہٗ ہماری خطا معاف کر دیں گے۔

پانچواں موقع صبر کا یہ ہے کہ مصیبت بیماری اور مال کے نقصان یا کسی قریبی عزیز کے مر جانے کے وقت صبر کرے، اس وقت کا صبر یہ ہے کہ زبان سے خلافِ شرع کلمہ نہ کہے۔ اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہ کرے کہ ایسا مجھ پر ظلم کیوں کیا، یا اتنی جلدی ہمارے عزیز کو کیوں موت دے دی اور نہ بین کر کے روئے۔

البتہ طبعی غم سے رونا اور آنسو بہانا اور اس صدمہ کا اپنے خاص احباب سے اس نیت سے اظہار کرنا کہ اس سے دل کا غم ہلکا ہو جاتا ہے، جائز ہے۔ کیونکہ بعض وقت بالکل صبر اور خاموشی سے دل کو بیماری لگ جاتی ہے۔ ایسے موقع پر اس کے ثواب کو یاد کرے اور یہ سوچے کہ یہ سب ہمارے فائدے کیلئے ہے اور یہ سوچے کہ بے صبری سے تقدیر تو ٹلتی نہیں، ناحق ثواب بھی کیوں کھویا جائے۔

جب پریشانی پہ مل جاتا ہے اجر ، پھر پریشانی ، پریشانی کہاں

اللہ رب العزت ہم سب کو صبر کرنے والا بنا دے۔ (آمین)

دنیا اور آخرت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط

”خوب سمجھ لو کہ اس دُنیا والی زندگی کی حقیقت بس یہ ہے کہ وہ نام ہے کھیل کود کا، ظاہری سجاوٹ کا، تمہارے ایک دوسرے پر فخر جتانے کا، اور مال اور اولاد میں ایک دُوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنے کا۔“ (سورہ حدید۔۲۰)

اس آیت میں مختصر اور جامع انداز میں پوری دنیاوی زندگی کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ کھیل کود، تماشا، بناؤ سنگھار ایک دوسرے پر فوقیت۔ ہر ایک کا اسی کوشش میں لگے رہنا کہ میرے پاس کسی طرح سب سے زیادہ مال و دولت جمع ہو جائے، یہ دنیا کی زندگی ہے۔ اور دنیا کی زندگی محض چند روزہ ہے جو کہ چند دنوں کی بہار اور دھوکہ کا سامان ہے۔ یہاں کی کھیل کود، آرائش و زیبائش، مال و دولت سب کچھ فانی اور ناپائیدار ہے۔ دنیا کی مثال اس کھیتی کی سی ہے جو پہلے سرسبز و شاداب ہوتی ہے پھر زرد ہوتی ہے اور آخر کار کٹ کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔

انسانی زندگی تین مراحل پر مشتمل ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ بچپن میں کھیل کود مرغوب ہوتا ہے، جوانی میں زیب و زینت کا خیال رہتا ہے، بڑھاپے میں اموال و اولاد میں ایک دوسرے پر فخر اور مقابلہ کی صورت ہوتی ہے۔ زندگی کے ان تینوں مراحل کا اس آیت کریمہ میں بیان ہے۔

سورہ حدید کی اس آیت کے بعد آخرت کیلئے فکر مند کرتے ہوئے فرمایا گیا:

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لا (سورہ الحدید۔۲۱)

”ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف اور اُس جنت کی طرف جس کی چوڑائی سارے آسمانوں اور زمین کی چوڑائی جیسی ہے۔“

یہاں مسابقت کا لفظ استعمال فرمایا گیا کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، صحت و تندرستی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ اس لئے نیک اعمال میں سستی اور ٹال مٹول نہ کرو اور نیک اعمال میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے آخرت کی مغفرت اور جنت کی وسعت کو بیان کر کے بتایا کہ دنیا کے جن اموال و اولاد میں باہمی فخر و غرور میں مبتلا ہو، ان سے بہتر ہے کہ اللہ کی مغفرت کی طرف دوڑو اور اس جنت کے حصول کی کوشش کرو جس کے سامنے پوری دنیا اور اس کے سامان تعیش و راحت ہیچ ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا کہ جس نے خود پر آخرت کی فکر کو سوار کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیاوی کاموں کو درست فرما دیتے ہیں۔

ان آیات کی روشنی میں ہم سب کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے کہ ہم اپنی صلاحیات کو دنیا کیلئے استعمال کر رہے ہیں یا آخرت کیلئے؟ کیا ہماری زندگی کھیل کود، زیب و زینت اور اموال و اولاد میں فخر کرنے جیسے امور میں صرف ہو رہی ہے یا ہم ان چیزوں سے اعلیٰ و ارفع چیز یعنی اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑ رہے ہیں؟

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہم سب کو ہر معاملہ میں دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دینے کی توفیق سے نوازیں۔ (آمین)

عمر شہید لائبریری UMAR SHAHEED LIBRARY Mohallah Qurbaan (Chakwal) Pakistan

انفاق فی سبیل اللہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ (ال عمران۔۹۲)

تم نیکی کے مقام تک اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچو گے جب تک ان چیزوں میں سے (اللہ کیلئے) خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں یہ بتایا گیا کہ کمائی کا بہترین حصہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ ناقص یا بے کار حصہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی راہ میں خرچ کر کے اجر و ثواب کی امید رکھنا حکمِ قرآن کے خلاف ہے۔

قرآن نے مال خرچ کرنے کو اللہ تعالیٰ کے تقرب اور رسول کریم ﷺ کی دعاؤں کا ذریعہ قرار دیا ہے اور وعدہ فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ایسے لوگوں کو اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ فیاضوں اور خدا ترسوں کیلئے وسیع جنت کا وعدہ ہے۔ علاوہ ازیں ہم ایسا بھی دیکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا، اجر و ثواب کی زیادتی، آخرت کی کامیابی اور وعدۂ جنت و رحمت کی بنا پر مسلمان اس وقت بھی نہایت اعلیٰ حوصلگی سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے کہ جب خود اس کے جیب و داماں خالی ہوتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب اور ایثار پیشہ بندوں کا تذکرہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے خاص طور پر کلام مجید میں ان الفاظ میں فرمایا:

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ ط (الحشر۔۹)

"اور اُن کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے اُن پر تنگ دستی کی حالت گذر رہی ہو۔"

اسلام کے احکامِ عبادات اور احکامِ معاملات دونوں میں اجتماعی مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ہر معاشرے میں محروم، مجبور، نادار اور مفلس بھی ہوتے ہیں اور مالدار باثروت افراد بھی۔ مالداروں کو اسلام اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنے مال میں محروموں کا حق تصور کرتے ہوئے انہیں دینے میں کسی بخل سے کام نہ لیں۔

اسلام فیاضی اور سخاوت کی تعلیم اس لئے بھی دیتا ہے کہ اس طرح دولت کبھی چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز نہ ہوگی اور اسلامی معاشرے کے سارے افراد اس سے بہرہ ور ہو کر متحد قوت کے ساتھ شر کا دفاع کر سکیں گے اور برائی کو روک سکیں گے۔

اسلام نے فیاضی، سخاوت اور انفاق کے تصور کو عقیدۂ آخرت سے وابستہ کیا ہے اور ملکیت مال کے متعلق بنیادی طور پر یہ احساس دلایا ہے کہ یہ تمہارے لئے بھی ہے اور دوسروں کیلئے بھی۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق مال و دولت ایک امانت ہے۔ اس لئے قرآن انفاق کیلئے محض ترغیب کا پیرایہ نہیں اختیار کرتا بلکہ مال اور دولت کو راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے پر وعید بھی سناتا ہے۔

وَمَا لَکُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۔ " اور تمہارے لئے کونسی وجہ ہے کہ تم اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرو۔"

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ تم میں سے کس کو اپنے مال کے مقابلے میں وارثوں کا مال زیادہ پسند ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کو اپنے مال سے زیادہ وارثوں کا مال عزیز ہو۔ فرمایا: تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا، یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کیا، اور جو اس نے پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارثوں کا مال ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی حقیقت کی اس سے بہتر ترجمانی اور کیا ہو سکتی ہے۔

نکاح میں تاخیر کیوں؟

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ ؕ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ (النور۔ ۳۲)

”تم میں سے جن (مردوں یا عورتوں) کا اس وقت نکاح نہ ہو، اُن کا بھی نکاح کراؤ، اور تمہارے غلاموں اور باندیوں میں سے جو نکاح کے قابل ہوں، اُن کا بھی۔ اگر وہ تنگ دست ہوں تو اللہ اپنے فضل سے اُنہیں بے نیاز کردے گا۔ اور اللہ بہت وسعت والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔“

نکاح ہر بالغ مرد و عورت کی ایک فطری خواہش اور اس کا بنیادی حق ہے جو انبیاء علیہم السلام کی سنت، عظمت آبرو کا پاسبان، قلب و نگاہ کی نگہبان، صحتِ انسانی کا محافظ و نگران ہے۔ شریعت اسلامی میں تبتل و تجرد کی کوئی گنجائش نہیں۔

احادیث میں نکاح کی ترغیب کے مضامین اس کثرت سے آئے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا ایک ضخیم کتاب کا کام ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں سو سے زائد روایات لکھی ہیں۔ ان میں چند ایک روایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں: ☆ نکاح نصف ایمان کی تکمیل ہے۔ (احمد عن انس) ☆ نکاح سید الکونین ﷺ کی محبوب سنت اور جزو فطرت ہے۔ ہر شیدائے سنت کو اس سنت کی تحصیل و طلب میں کوشاں ہونا چاہیئے۔ جس نے اس سنت سے منہ پھیرا اس سے آپ ﷺ بیزار ہیں۔ ☆ امت کے شریر لوگ بے نکاح لوگ ہیں۔ (مسند۔ ابی یعلی عن ابو ہریرہؓ) ☆ جب کوئی مسلمان نکاح کرتا ہے تو شیطان چلا اٹھتا ہے کہ ہائے! یہ شخص اپنا دو تہائی ایمان بچا لے گیا۔ (مسند ابی یعلی عن جابرؓ) ☆ بے نکاح مرد اور بے شوہر عورت حد درجہ قابل رحم اور تہی دست ہیں۔ گو کہ مال والے ہوں۔ آپ ﷺ نے ان کو تین مرتبہ مسکین فرمایا ہے۔ (بیہقی شعب الایمان) ☆ مہر مقرر کر کے (خواہ تھوڑی مقدار میں ہو) اپنی بیواؤں اور رنڈوؤں کے نکاح کرو۔ (طبرانی کبیر عن ابن عباسؓ) ☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر میری زندگی کے صرف دس روز باقی رہ جائیں تب بھی میں خواہش کروں گا کہ نکاح کرلوں (کہ یہ مختصر سی زندگی بھی بے نکاح نہ گزرے) تاکہ کل روزِ قیامت خدا تعالیٰ کے حضور رنڈوا بن کر پیش نہ ہوں۔ (احیاء العلوم ص ۲۲۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یکے بعد دیگرے پانچ نکاح: (۱) آپ کی پہلی شادی حضرت عبداللہ بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی، وہ جنگ طائف میں شہید ہوگئے۔ (۲) پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ شادی ہوئی وہ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ (۳) پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ شادی ہوئی وہ بھی شہید ہوگئے۔ (۴) پھر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے ساتھ شادی ہوئی وہ بھی شہید ہوگئے۔ (۵) پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شادی ہوئی تو وہ بھی کربلا میں شہید ہوگئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو شہادت کی تمنا ہو وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کرلے۔ ان شاء اللہ شہید ہوجائے گا۔ (دیوان الحماسہ)

آج ہمارے معاشرہ میں جن اہم امور میں غفلت عام ہے ان میں ایک نکاح بھی ہے جس میں بلاوجہ تاخیر کردی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں بعض دفعہ ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں جو خاندان بھر کی رسوائی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ عہدِ نبوت میں نکاح جس قدر آسان تھا شاید ہی کوئی دوسرا عمل ہو، جس کی مثال مذکورہ بالا واقعہ ہے۔

عہد و پیمان

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاَوْفُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ اِذَا عٰھَدْتُّمْ (النحل۔۹۱) ''اور جب تم نے کوئی معاہدہ کیا ہو تو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرو۔''

اس ارشاد کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی مسلمان عہد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ مسلمان کیلئے وعدہ خلافی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو دنیا میں اس کے برے نتائج بھگتنے کے علاوہ آخرت میں جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ایک آدمی کو تو صرف مادی نقصان کا خوف ہی عہد شکنی سے روکتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان کو دنیا میں بے عزت ہونے کے علاوہ عقبیٰ میں سزا کا خوف بھی معاہدے کو توڑنے سے باز رکھتا ہے۔

دنیا کی کوئی سوسائٹی، کوئی سماج، کوئی معاشرہ ہو اس کی بقا اور اس کی زندگی عہد و پیمان کے احترام پر مبنی اور منحصر ہوتی ہے۔ جس معاشرے کے افراد باہمی تعلقات میں، انفرادی لین دین میں، اجتماعی معاملات میں قابل اعتماد ہوں۔ وعدوں کا پاس لحاظ کرتے ہوں اور جو بات کہتے ہوں اس کی صداقت مشکوک اور اس کا اعتبار مشتبہ نہ ہو تو وہ معاشرہ نہ صرف ترقی کرتا ہے بلکہ دنیا کیلئے ایک مثالی بھی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرے کے افراد عہد و پیمان کی پابندی نہیں کرتے وہ گویا زوال کو دعوت دیتے ہیں۔ ایسا معاشرہ اپنا اعتبار اور وقار کھو دیتا ہے اور اس کا دنیا میں کوئی مقام نہیں رہتا۔ فرد کی طرح ہر معاشرے کی بھی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ یہ شخصیت ان اوصاف اور عوامل سے بنتی ہے کہ جو اس معاشرے کے افراد اپنے قول و عمل میں برتتے ہیں۔ یہی شخصیت ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے سے ممتاز و ممیز کرتی ہے اور اس کی بنا پر قوموں کی برادری میں اس کا مقام متعین ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں جس قسم کے لوگوں کی اکثریت ہوگی، اسی قسم کا اطلاق اس معاشرے پر بھی ہوگا۔ مثلاً اگر کسی جماعت یا قوم کے افراد کی زیادہ تعداد سست اور کاہل ہو تو اس قوم کو بھی مجموعی طور پر کاہل کا لقب مل جائے گا۔ اسی طرح افرادِ قوم کی اکثریت اپنے معاملات و معاہدات سے جس قسم کا تاثر دوسری اقوام پر چھوڑے گی۔ وہی تاثر پوری قوم پر منطبق ہوگا۔ اسی لئے مصلحین، مبلغین اپنی قوم کی بقا کیلئے وہ اوصاف نمایاں کرنا چاہتے ہیں جو اس کو قابلِ اعتبار اور باوقار بنا دیں اور جن سے قومی شخصیت نکھر کر سامنے آجائے۔ یہی چیز کسی معاشرے کو عزت و احترام کا مستحق بناتی ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَھْدِ ۚ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا ۝ (الاسرا۔۳۴)

''اور عہد کو پورا کرو، عہد کے بارے میں (تمہاری) باز پرس ہونے والی ہے۔''

اس حکم سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عہد کی پابندی کتنی ضروری قرار دی گئی ہے۔ الغرض معاہدہ چاہے دو افراد کے درمیان ہو یا دو اقوام کے درمیان۔ چاہے اس کی نوعیت سیاسی ہو یا تجارتی، اجتماعی ہو یا ذاتی، اس کی پابندی اور تعمیل ضروری ہے اور یہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ عہد و پیمان اور معاہدات کی پابندی کی جو تعلیم دی گئی ہے، اس پر تعمیل کر کے اس کے فوائد و ثمرات سے مستفید ہوں۔

آدابِ معاشرت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝ (القلم۔۴) ''اور یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر ہو۔''

روئے زمین پر ہر معاشرہ اپنے افراد کی زندگی کے آداب اور طور طریقوں کے بارے میں کچھ اصول رکھتا ہے۔ گزر بسر، رہن سہن، آپس کے روابط و تعلقات، ملنے جلنے اور مختلف اجتماعی موقعوں پر برتنے کے یہ اصول ہر معاشرے نے اپنی ذاتی ضروریات، مقامی حالات اور رسم و رواج کے پیش نظر مقرر کئے ہیں۔ لیکن اسلام اس میدان میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے اصولِ حیات، طرز سلوک اور معاشرت کے آداب وحی الٰہی پر مبنی ہیں۔ اس لئے ہم مسلمان اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہمارے آداب معاشرت کی بنا اللہ علیم و خبیر کی ہدایات پر ہے جو انسان اور حیات انسانی کی ضروریات سے باخبر ہی نہیں، ان کا خالق بھی ہے۔

آداب معاشرت میں سب سے بلند مقام اخلاق کا ہے۔ اسلام نے زندگی میں اخلاق کو سب سے زیادہ بلند مقام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے رسول برحق ﷺ کو معلم الاخلاق فرمایا ہے۔

اور پھر اللہ کے رسول نے فرمایا:

''مسلمانوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق عمدہ ہوں۔''

میزان میں جو چیز سب سے زیادہ بھاری ہوگی وہ حسنِ اخلاق ہے۔ اور یہ کہ کسی انسان کا ایمان کامل نہیں ہوتا جب تک اس کے اخلاق اچھے نہ ہوں۔

آداب معاشرت میں سے سب سے پہلا ادب یہ ہے کہ ہم اپنے اخلاق کو بلند کریں۔ ہم مسلمان ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی عزت کریں، ایک دوسرے کا احترام کریں۔ عزت و احترام میں سب سے اہم اخلاق ہے۔ معاشرتی آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اولاد ماں باپ کا احترام کرے، شاگرد استاد کا ادب و احترام کرے، بزرگ بچوں سے محبت کریں اور بچے بزرگوں کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ اس کے بغیر معاشرتی آداب کا کبھی حق ادا نہ ہوگا۔

ہماری معاشرتی ناہمواریوں نے اور آداب معاشرت سے صرفِ نظر نے نہ صرف ہماری اپنی زندگیوں کو بے مزہ اور تلخ کر دیا ہے، اور سکون و اطمینان کی سچی دولت سے ہمیں محروم کر کے رکھ دیا ہے بلکہ ہمارے پیارے وطن کیلئے شدید ترین مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ معاشرتی آداب کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا تقاضا یہ ہے، کہ ہم اپنے دین اور دنیا کے ہر معاملے کو درست کریں، اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کریں، امانت و دیانت کو اپنائیں، پرہیزگاری کی زندگی بسر کریں، حیاء و شرم کو زیور بنالیں، ایفائے عہد کریں، غیرت اور قناعت کی راہ اختیار کریں۔ ہماری زبانوں پر کلمۂ کذب اور ایک لفظ جھوٹ کا نہ آئے اور صدق مقال ہوں، سچائی ہمارا شیوہ ہو، کسب حلال اور رزق حلال پر ہمارا یقین ہو، عجز و انکسار ہمارا اصول ہو، حفظ لساں ہمارا وطیرہ ہو۔ اگر ہم ان آداب سے روگردانی کریں گے تو ذلت کے گڑھے میں جا گریں گے اور اقوامِ عالم میں ہمارا کوئی ممتاز مقام نہ ہوگا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

رسم ورواج کی پابندی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝ (الاعراف۔۳۱) ”یاد رکھو کہ اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔“

فضول خرچی پر ناپسندیدگی کا اظہار فرما کر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے انسان کو غیر ضروری بوجھ سے آزاد کیا ہے، لیکن انسان خود اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ بوجھ لادتے جا رہے ہیں۔ رسم ورواج کی پابندیوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا اور ان کو اپنے اوپر لازم قرار دے لینا بھی اپنے اوپر بوجھ میں اضافہ کرنا ہے، جس سے بہت سی اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور فرد اور معاشرہ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں زندگی کے ہر شعبے اور ہر مرحلے کے متعلق ہدایات عطا فرمائی ہیں اور اپنے عمل مبارک سے بھی اس کا نمونہ دکھایا ہے۔ ہمیں اپنی اجتماعی زندگی میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ مراحل اور مواقع بنیادی طور پر دو ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ خوشی اور غم۔ ہماری بعض تقریبات خوشی پر مبنی ہوتی ہیں اور اظہارِ مسرت کیلئے منعقد کی جاتی ہیں۔ بعض تقریبات کسی غم ناک حادثے اور واقعہ سے متعلق ہوتی ہیں اور اظہارِ غم اور اظہارِ ہمدردی کیلئے ہوتی ہیں۔

آپ اس قسم کے مواقع پر ادا کی جانے والی رسموں کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ خوشی کے مختلف مواقع پر ہمارے ہاں جو رسمیں عام ہو گئی ہیں ان میں سے بہت سی رسمیں جائز و مباح ہیں، بشرطیکہ ان میں اسراف سے کام نہ لیا گیا ہو۔ ان میں غیر ضروری خرچ نہ کیا گیا ہو۔ البتہ بعض رسمیں شرعی نقطۂ نظر سے ہمت افزائی کی مستحق نہیں ہیں۔

اس کے برعکس غم کے مواقع پر ادا کی جانے والی رسموں میں سے کچھ رسمیں مباح اور جائز ہیں، کچھ مکروہ ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جن کو علمائے امت نے جائز نہیں بتایا ہے۔

اس کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ تقاریبِ مسرت کی رسوم میں اسراف اور جذبۂ نمائش کی تسکین سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ مگر تقاریبِ غم کی رسوم کے ساتھ تقربِ الٰہی کا تصور بھی ہوتا ہے۔ یعنی غم کے مواقع پر اور خصوصاً موت کی مجلسوں میں ہم بعض ایسے افعال انجام دے کر اور ایسے مصارف کر کے اور بعض رسمیں ادا کر کے یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ یہ تقرب خداوندی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ حالانکہ کسی ایسے قاعدے کو جو خود ہمارا اپنا بنایا ہوا ہو اور جس کا شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مبارکہ میں کوئی نمونہ نہ ملتا ہو بلکہ جس میں ناجائز ہونے کا پہلو نکلتا ہو اس کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا ذریعہ سمجھنا حرام ہے۔

شادی کے سلسلے میں ہمیں سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت پاک اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرتوں میں جو نمونے ملتے ہیں وہ سادگی کے معیاری نمونے ہیں۔ صحیح چیز یہ ہے کہ اپنی تقریبوں میں ہم ان معیاری نمونوں کی کامل تقلید کریں۔ ہمیں ان رسم ورواج سے ضرور بچنا چاہیئے جن میں حرمت و کراہت کا پہلو نکلتا ہو اور ان رواجوں سے پرہیز کرنا چاہیئے اور اسراف و تبذیر اور بے جا خرچ کے ذیل میں آتے ہیں۔ البتہ ان رسموں کے برتنے میں کوئی حرج نہیں جو تمدن کی پیچیدگی کی بنا پر رائج ہوئی ہیں اور جن میں بہت سی معاشرتی مصلحتیں ہیں جو بے ضرر ہیں۔ اور نقصان رساں نہیں ہیں اور جن میں نمائش کا پہلو نہیں ہے۔ اپنی تمام رسموں میں ہمیں اس نکتے کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

محفل کے آداب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ ج (المجادلۃ:۱۱)

"اے ایمان والو! جب تم سے کہا جاتا ہے کہ مجلسوں میں دوسروں کیلئے گنجائش پیدا کرو، تو گنجائش پیدا کر دیا کرو، اللہ تمہارے لئے وسعت پیدا کرے گا۔"

عقائد و عبادات اور معاملات کے علاوہ اسلام نے مجلس کے آداب کی بھی تعلیم دی ہے۔ ایک انسان گھر میں اکیلا ہو تو آزاد ہے، جیسے چاہے رہے۔ لیکن جب وہ کسی مجمع یا جماعت یا محفل میں شریک ہوتا ہے تو اس کی حیثیت مجلس کے ایک فرد کی ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ محفل و مجلس میں اس طرح شریک ہو اور اس طرح بات چیت کرے کہ تمام محفل والوں کیلئے اس کی موجودگی خوش گوار اور پسندیدہ ہو۔ اس کا محفل میں آنا جبر نہ ہو اور محفل میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کو مدنظر رکھے کہ تمام شرکائے محفل میں سے ہر ایک کا حق برابر ہے۔

اسی لئے اسلام یہ بتاتا ہے کہ محفل میں انسان کو جہاں بلا تکلف پہلے جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جائے۔ یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں احساسِ برتری پیدا ہوتا ہے۔ اکثر جمعہ کی نماز میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جو لوگ پہلے آتے ہیں وہ بے ترتیب بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ بالکل آخر وقت آتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ اگلی صفوں میں جگہیں موجود ہیں تو وہ صفوں کو چیر کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ بے ترتیبی بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے۔

یہ بات بھی اکثر دیکھی گئی ہے کہ دو اشخاص آپس میں بات چیت کرنے یا کسی اور مصلحت باہمی کی وجہ سے آس پاس بیٹھے ہیں کہ ایک تیسرا آدمی آیا اور دونوں کے درمیان دھنس گیا۔ اس طرح اس نے دونوں کے دلوں میں اپنے خلاف ناپسندیدگی بلکہ ناراضگی کا جذبہ پیدا کر دیا جو کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔

محفل میں بیٹھ کر نرمی اور محبت کی باتیں کرنی چاہئیں۔ کوئی مسئلہ ایسا آجائے جس میں اختلاف کرنا ہی ہے تو بھی حسنِ تکلم کے ساتھ مداخلت کی جائے اور کسی طرح محفل میں تکدر پیدا نہیں ہونے دینا چاہیئے۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ کچھ لوگ محفل میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوں تو کسی کو اس حلقے کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔ کیونکہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اس کا منہ ہوگا اور کچھ لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی جو بڑی بدتمیزی ہے۔

اسی طرح محفل میں سے کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیئے کیونکہ یہ غیر مسلم بادشاہوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر اور درباری وزراء امراء بادشاہ کے گرد کھڑے رہتے تھے۔ اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جو شرک کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسی مجلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا چاہیئے جو نیک اور اللہ والے اور متقی لوگوں کی ہوں۔ ایک انسان جن لوگوں کی صحبت کو پسند کرتا ہے اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ مسلمان کی محفل ایسی ہونی چاہیئے جس سے وقار اور بردباری ظاہر ہو اور اس میں اچھی باتیں زیرِ بحث آیا کریں۔

مجلس کے آداب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ط (الحجرات ۔ ۱۱) ”ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔“

ادب، سلیقہ، شائستگی، پاکیزگی، تمیز و وقار، نظم و ضبط، عالی ظرفی، شرافت و متانت، جرأت استقلال، ہمدردی و خیر خواہی، حسنِ ذوق اور حسنِ انتخاب، ایثار و قربانی، خلوص اور بے لوثی، فرض شناسی، حلم و بردباری، علم و عمل، تواضع، وانکساری، شیریں کلامی، خداترسی اور پرہیزگاری اسلامی زندگی کے یہ وہ دلکش خدوخال ہیں کہ جن سے انسان کی حیات سنورتی ہے اور انسانیت درجۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ اور شرافت اپنی انتہا کو چھوتی ہے۔ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کا تصور دیا ہے جس میں انسان ان اوصافِ حسنہ سے متصف ہو اور اخلاق عالیہ سے سرشار و سرفراز۔ جس معاشرے میں ایسے انسان موجود ہوں، اس کی معراج مسلّم اور اس کی بلندی شک و شبہ سے بالاتر۔ یہی معاشرہ اسلامی ہے اور اس معاشرے کا انسان وہی ہے کہ جس کے یہ خدو خال ہوں۔ ایسے افراد اس وقت وجود میں آتے ہیں کہ جب وہ کتاب و سنت، قرآن و حدیث اللہ اور اس کے رسول نبی آخر الزمان ﷺ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوں۔ اور اپنی زندگیوں کو ان کی ہدایات کے مطابق بناتے ہوں۔ یہی لوگ صحیح مسلمان ہیں اور اسلام کے مطابق اپنی حیات بسر کرتے ہیں۔ اسلام نے ہر شعبۂ حیات کیلئے آداب کا تعین کیا ہے:

آدابِ مجلس جن کی طرف قرآن و حدیث نے دعوت دی ہے ان میں چند یہ ہیں جن کا ہمیں خیال رکھنا چاہیئے۔

☆ جب کوئی مجلس میں پہنچے تو پہلے سلام کرے، کیونکہ سلام سے باہمی تعلق و تعارف اور احترام و خیر خواہی کا اظہار ہوتا ہے۔

☆ مجلس میں جہاں جگہ ملے وہاں بیٹھ جانا چاہیئے۔ مجلس میں کسی امتیازی جگہ پر جا کر بیٹھنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ جہاں میزبان بٹھانا چاہے اس کو اپنے لئے پسند کرنا چاہیئے۔ ☆ مجلس میں خندہ پیشانی، اطمینان و مسرت کے ساتھ بیٹھنا چاہیئے اور گفتگو میں توجہ کے ساتھ حصہ لینا چاہیئے۔ ☆ مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی اٹھ کر چلا جائے تو اس کی جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔

☆ مجلس میں دو آدمیوں کو کانا پھوسی اور سرگوشی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ حرکت مجلس کے دوسرے شرکاء کیلئے پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ ☆ مجلس میں جو کہنا ہو صدرِ مجلس کی اجازت سے کہنا چاہیئے اور ایسا انداز اختیار نہیں کرنا چاہیئے کہ صدر کا مقام مجروح ہو۔ ☆ ایک دوسرے کی غیبت نہیں کرنی چاہیئے۔ ☆ گفتگو میں آواز کو نیچا رکھنا چاہیئے۔

☆ ایک دوسرے کا مذاق نہیں اڑانا چاہیئے۔ ☆ مجلس میں بے حیائی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ☆ لوگوں سے بے رخی نہیں کرنی چاہیئے۔ ☆ حق و باطل، سچ اور جھوٹ کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیئے۔ ☆ لوگوں کو برے ناموں سے نہیں پکارنا چاہیئے۔

آدابِ مجلس کے سلسلے میں یہ چند اسلامی اصول ہیں، اگر ہم ان کو اپنا رہنما بنالیں اور اپنی تمام مجالس و محافل میں ان کا خیال کریں تو یقیناً ہماری مجلسیں و محفلیں زیادہ پرلطف اور مؤثر ہوں گی اور پر مقصد۔ اور جب ہم ان بنیادی آدابِ مجلس کو نظر انداز کریں گے تو ہماری مجلسیں بے لطف، بے اثر اور بے نتیجہ ہو جائیں گی۔

دعا کی فضیلت واہمیت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ط ''مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔'' (المؤمن۔۶۰)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَہ . ''یعنی دعا مانگنا بھی عبادت ہے۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ''دعا عبادت کا مغز ہے۔'' (ترمذی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر شخص کو اپنے رب سے اپنی ضرورتوں کو مانگنا چاہیئے۔'' (ابوداؤد۔ترمذی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز پسندیدہ نہیں۔'' (ابن ماجہ)

☆ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگوں میں ایک کمزوری یہ ہے کہ مریض کی شفا کیلئے دوا، علاج، معالجہ اور دیگر بہت سی قسم کی تدابیر تو اختیار کی جاتی ہیں اور پیسے بھی پانی کی طرح بہائے جاتے ہیں، لیکن دعا کا اہتمام نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ حالانکہ دعا عظیم ترین تدابیر میں سے ہے۔ اس کی توفیق نہ ہونا اور اس کی طرف توجہ نہ کرنا یہ سخت محرومی کی بات ہے۔ اگر ہو سکے تو مریض کو خود بھی دعا کرنا چاہیئے، کیونکہ حالتِ مرض میں دعا قبول ہوتی ہے۔ ورنہ اس کے متعلقین کو مکمل توجہ اور دھیان سے دعا کرنی چاہیئے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں سچ کہتا ہوں جو دعا دل سے کی گئی کبھی یاد نہیں کہ وہ قبول نہ ہوئی ہو۔ دل سے کی جانے والی دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے، ہاں اگر کوئی دعا قبول نہ ہوئی تو اس میں اپنی کوتاہی ہوتی ہے، میں نے تو ہمیشہ تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔

☆ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدمی کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعا مانگتا رہے تاکہ وہ ہم غرباء اور کمزوروں کو ابتلاء امتحان سے محفوظ رکھیں۔

پھر فرمایا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ بندہ جیسا گمان رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ فرماتے ہیں۔ اس میں حضرت حاجی صاحب نے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا: (۱) ایک تو یہ ہے کہ دعا ہر حال میں فائدہ سے خالی نہیں یا تو مطلوب چیز مل جاتی ہے یا آخرت کیلئے ذخیرہ ہو جاتی ہے، یا پھر دعا کی برکت سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ دعا مانگنے والے کی طرف آنے والے مصائب وفتن سے حفاظت فرما لیتے ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ جس معاملہ میں جیسا حسنِ ظن ویقین رکھے گا ادھر سے بھی ویسا ہی معاملہ اس کے ساتھ کیا جائے گا۔ یہ بھی حدیث پاک ہی کا مفہوم ہے۔

☆ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ قصور (یعنی گناہوں) کا اعتراف (واقرار) کرنا اور اس پر نادم ہونا اور خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا یہ کمالِ انسانی ہے۔ پھر فرمایا اپنے کرتوت (یعنی بدعملی) پر نظر نہ کریں بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رحمت پر نظر رکھیں اور اپنے کام میں مشغول رہیں اس سے کامیابی کے دروازے کھلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ بہر حال! ہمیں ہر حال میں اور ہر مقصد کیلئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعا مانگتے رہنا چاہیئے۔ اللہ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

دعا آہستہ یا اونچی؟

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ (الاعراف۔۵۵)

''تم اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ چپکے چپکے پکارا کرو۔ یقیناً وہ حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے ہمیں ایک خاص ادب سکھایا ہے کہ دعا آہستہ آواز میں مانگنی چاہیئے۔ ☆ دعا ایمان کا نشان، تعلقِ الٰہی کی دلیل، مغزِ عبادت، حقیقت عبودیت، جانِ بندگی اور رونق درویشی ہے۔ ☆ دعا بندہ کا رب سے قوی رابطہ، مومن کا اسلحہ، بے تاب روح کی غذا اور زخمی دل کا مرہم ہے۔ ☆ دعا فقراء کا خزانہ، مسکینوں کا توشہ، ناداروں کی ڈھارس، لاچاروں کی تسکین، بے نواؤں کی تسلی، ضعیفوں کی قوت، راہِ حق کے طلب گاروں کی ڈھال اور سالکینِ طریق کا زادِ راہ ہے۔ ☆ دعا کا شغف واشتغال (مشغولیت) اس میں گریہ وزاری (رونا دھونا) تضرع وخشوع (عاجزی)، توحید وللٰہیت، صفاتِ الٰہیہ پر ایمان کامل اور یقین راسخ کا نتیجہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی تعریف فرمائی اس بات پر کہ وہ اپنے رب کو آہستہ آواز سے پکارتے ہیں۔ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا ۝ (مریم۔۳) ''یہ اُس وقت کی بات ہے جب انہوں نے اپنے پروردگار کو آہستہ آہستہ آواز سے پکارا تھا۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے آہستہ آواز سے دعا کرنے میں مختلف حکمتیں بیان کی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں: (۱) یہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہے گویا بندہ کو یہ یقین ہے کہ میرا رب میری آہستہ مانگی ہوئی دعا کو بھی سنتا ہے۔ (۲) یہ دعا تعظیم اور ادب کی زیادہ حامل ہے کیونکہ بادشاہ اور قابل عزت واحترام لوگوں کو آہستہ آواز میں ہی مخاطب کیا جاتا ہے۔ (۳) یہ خشوع وخضوع کی دلیل ہے جو دعا کی روح ہے۔ کیونکہ بندہ جب ٹوٹے دل عاجزی وانکساری اور خوف وخشیت سے دعا مانگتا ہے تو زبان بھی لڑکھڑا اٹھتی ہے اور متکلم کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ (۴) یہ اخلاص کامل کی دلیل ہے۔ (۵) بلند آواز سے دعا کرنے میں یکسوئی نہیں رہتی جب کہ آہستہ آواز سے دعا مانگنے میں یکسوئی باقی رہتی ہے۔ (۶) جو ذات کسی کے قریب ہو اسے بلند آواز سے نہیں پکارا جاتا اس لئے آہستہ آواز سے دعا مانگنا قرب خداوندی کی دلیل ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۸۶)

''اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں۔ لہٰذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔''

(۷) آہستہ آواز سے دعا مانگنے میں سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے اور بندہ اضطراب اور گھبراہٹ کی کیفیت میں مبتلا نہیں ہوتا۔ (۸) آہستہ آواز سے دعا کرنے میں طلب اور سوال کا تسلسل قائم رہتا ہے جبکہ بلند آواز سے دعا مانگنے میں آدمی تھک جاتا ہے۔ اکتاہٹ محسوس کرتا ہے اور طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔

علمائے امت لکھتے ہیں کہ اگر تعلیماً اونچی آواز سے دعا مانگے تاکہ لوگوں کو دعائیہ کلمات معلوم ہوں تو اونچی آواز سے دعا مانگنے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر افضل اور بہتر آہستہ آواز ہی سے دعا مانگنا ہے۔

معاف کرنے کا اجر وثواب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (آل عمران۔۱۳۴)

"اور جو غصے کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کر دینے کے عادی ہیں۔ اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

میرے بندے غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کی برائیوں سے درگذر کرنے والے ہی ہوتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ اے ابن آدم! اگر غصہ کے وقت تو مجھے یاد رکھے گا یعنی میرا حکم مان کر غصہ پی جائے گا تو میں بھی اپنے غصہ کے وقت تجھے یاد رکھوں گا۔ یعنی ہلاکت کے وقت تجھے ہلاکت سے بچالوں گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

☆ ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ: "جو شخص اپنا غصہ روک لے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس پر سے اپنا عذاب ہٹا لیتے ہیں۔"

☆ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ پہلوان وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ حقیقت میں پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ (مسند احمد)

☆ کسی شخص نے جناب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے وصیت کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "غصہ نہ کیا کیجئے۔" وہ کہتے ہیں میں نے جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ تمام برائیوں کا مرکز غصہ ہی ہے۔ (مسند احمد)

☆ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں سے سوال فرمایا: "تم پہلوان کسے جانتے ہو؟ لوگوں نے کہا جسے کوئی گرا نہ سکے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا نہیں بلکہ حقیقت میں زوردار پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے جذبات پر قابو رکھے۔ (مسلم)

☆ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: "جو شخص کسی تنگدست کو مہلت دے یا اپنا قرض اسے معاف کر دے اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے آزاد کر دیتے ہیں۔ اسی حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو کسی گھونٹ کا پینا اتنا پسند نہیں، جتنا غصہ کے گھونٹ کو پی جانا۔ (مسند احمد) ☆ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ "جو شخص قدرت کے باوجود اپنے غصہ کو ضبط کر لے اسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے پسند کر لے۔ (مسند احمد)

☆ ایک حدیث میں ہے: "قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکارے گا اے لوگو! اے درگذر کرنے والو! اپنے رب کے پاس آؤ اور اپنا اجر وثواب لو۔ مسلمانوں کی خطاؤں کو معاف کرنے والے جنتی لوگ ہیں۔

☆ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جو شخص اپنے غصہ پر عمل کر سکتا ہو اور پھر اپنے غصہ کو دبا لے، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ قیامت کے دن اس کے دل کو خوش کر دے گا۔

انجیل (اللہ کی کتاب جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی) میں لکھا ہے: "اے انسان! جب تجھے غصہ آئے مجھے (اللہ کو) یاد کر لیا کر، میں بھی اپنے غصہ کے وقت تجھے یاد رکھوں گا، میری مدد پر بھروسہ رکھ۔ میری مدد تیرے حق میں تیری اپنی مدد سے کہیں (بہت زیادہ) بہتر ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہم سب کو غصے پر ضبط کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

مردوں کی ایک کوتاہی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (التحریم۔۶)

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ۔"

مردوں سے ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذمہ بیوی کے صرف دنیوی حقوق سمجھتے ہیں۔ دینی حقوق اپنے ذمہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہمارا ذمہ ان کے دین کا بھی کوئی حق ہے۔ مثلاً گھر میں آکر یہ تو پوچھتے ہیں کہ کھانا تیار ہوا یا نہیں، مگر یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ تم نے نماز بھی پڑھی یا نہیں۔ اگر کھانا کھانے گھر میں آئے اور معلوم ہوا کہ بیوی نے اس وقت کی نماز ابھی تک نہیں پڑھی تو ان کو ذرا بھی ناگواری نہیں ہوتی، نہ بیوی پر خفا ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر کسی کی بیوی عمر بھر بھی نماز نہ پڑھے تو بہت سے مردوں کو اس کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ اور جو کبھی کسی کو کچھ خیال بھی ہوتا ہے اور یہ وہ ہیں جو دیندار کہلاتے ہیں تو وہ بھی یوں چلتی سی بات کہہ دیتے ہیں کہ بی بی نماز پڑھا کرو نماز کا ترک کرنا (چھوڑنا) بڑا گناہ ہے۔ بس اتنا کہہ کر اپنے نزدیک یہ سبکدوش (بری الذمہ) ہو گئے اور جب کسی نے ان سے کہا کہ تم اپنی بیوی کو نماز کیلئے تنبیہ کیوں نہیں کرتے؟ تو یہ جواب دیتے ہیں کہ تو دیا تھا اب وہ نہیں پڑھتی تو میں کیا کروں؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ انصاف سے بتایئے کیا آپ نے نماز کیلئے اسی طرح کہا تھا جیسے نمک تیز ہونے پر کہا تھا۔ اور اگر ایک دفعہ کے کہنے سے اس نے نمک درست نہ کیا تو وہاں بھی آپ ایسے ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ جیسے نماز کیلئے ایک دو دفعہ کہہ کر خاموش ہو گئے؟ ہرگز نہیں، نمک تیز ہونے پر تو آپ سر توڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور ایسی بری طرح خفگی (ناراضگی) ظاہر کرتے ہیں کہ بیوی سمجھ جاتی ہے کہ میاں بہت ناراض ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ بہت جلد نمک کی اصلاح کا اہتمام کرتی ہے۔

صاحبو! نماز کیلئے آپ نے اس طرح کبھی نہیں کہا جس سے بیوی سمجھ جائے میاں بہت ناراض ہو گئے ہیں۔ اگر یہاں بھی اسی طرح خفگی ظاہر کرتے تو وہ اس کا بھی ضرور اہتمام کرتی اور ایک دفعہ کے کہنے سے نہ پڑھتی تو دوسرے وقت پھر خفا ہوتے، پھر خفا ہوتے پھر نہ پڑھتی تیسرے وقت پھر کہتے۔ اور جب تک وہ نماز نہ پڑھتی برابر کہتے رہتے اور مختلف طریقوں سے اپنی خفگی ظاہر کرتے۔ مثلاً: پاس لیٹنا چھوڑ دیتے یا اس کے ہاتھ کا پکا ہوا نہ کھاتے جیسا کہ نمک کی تیزی پر ایک بار خفا ہونے سے اثر نہ ہوا تو آپ خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ برابر کہتے رہتے ہیں۔ اور وہاں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اتنی دفعہ تو کہہ دیا ہے اب بھی وہ نہیں مانتی تو میں کیا کروں، بس خاموش ہو جاؤں۔

صاحبو! انصاف سے بتایئے ہم نے کبھی کھانے پینے کے بارے میں بھی اپنے جی کو اس طرح سمجھا لیا جیسا نماز کے بارے میں سمجھا لیا جاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ تو سراسر کوتاہی ہے اگر آپ بیوی کو نمازی بنانا چاہیں تو کچھ مشکل بات نہیں، کیونکہ عورت حاکم نہیں بلکہ محکوم ہے۔ چنانچہ اپنی اغراض و مقاصد کیلئے ان پر حکومت بھی کی جاتی ہے، مگر دین کیلئے اس حکومت سے ذرا کام نہیں لیا جاتا۔

حسنِ عمل نہ کہ کثرت عمل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط (الملک۔۲)

"جس نے موت اور زندگی اس لئے پیدا کی تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے۔"

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے اس ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ آسمان وزمین اور موت وحیات پیدا کرنے سے تمہاری آزمائش مقصود ہے کہ کون اچھا عمل کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو کثرت عمل سے حسنِ عمل زیادہ پسندیدہ ہے، ایک آدمی ایک گھنٹہ میں قرآن مجید کے چار پارے بغیر تجوید کے تیزی سے پڑھتا ہے اور دوسرا تجوید کے مطابق دو پارے پڑھتا ہے تو یہ دو پارے ان چار سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو زیادہ محبوب ہیں۔ وہ سو (۱۰۰) رکعات نوافل جو تیزی سے پڑھی جائیں ان سے وہ چار رکعات زیادہ پسندیدہ ہیں جو سکون و اطمینان کے ساتھ ادا کی جائیں۔ اور عمل میں حسن دو باتوں سے پیدا ہوتا ہے: (۱) اخلاص (۲) سنت نبوی کے مطابق ہونے سے۔

اخلاص کا معنی ہے خالص کرنا جس کے دو مطلب ہیں۔ (۱) اپنے آپ کو خالص کرنا یعنی عمل کے اندر اپنی پوری توجہ لگانا مثلاً نماز میں پورا خشوع وخضوع ہو کہ نہ ظاہر کسی طرف متوجہ ہو اور نہ باطن۔ اعضاء بھی سکون میں ہوں اور دل ودماغ کی توجہ بھی نماز میں ہو۔ اگر نماز میں خیالات آئیں تو خیالات آنے میں حرج نہیں۔ کیونکہ یہ غیر اختیاری چیز ہے۔ جب خیالات آئیں تو انہی میں نہ لگا رہے جب ذرا خیال آیا تو فوراً نماز کی طرف متوجہ ہو جائے اور یہ خیال کا پھیرنا بندہ کے اختیار میں ہے۔

نماز میں خیالات سے بچنے اور توجہ کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ناظرہ خواں کی طرح الفاظ کو ادا کرے اور ہر ہر لفظ پر توجہ دے کہ اب سبحانک اللّٰھم پڑھ رہا ہوں، اب الحمد للہ رب العالمین پڑھ رہا ہوں۔ اس سے پوری توجہ نماز میں رہے گی۔ البتہ خود خیالات لانا اختیاری بات ہے اس لئے اس سے بچے۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ اخلاص کے خلاف ہے۔

اخلاص کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اپنے عمل کو خالص کرنا یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کیلئے کرنا کہ دکھاوا مقصود نہ ہو۔ اخلاص یہ ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ راضی ہوں، روزہ رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ راضی ہوں، صدقات حج وغیرہ ہر عبادت میں اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو۔ ایسے اخلاص پر عبادت کی قبولیت کی شرط ہے۔ اگر کسی بھی عمل میں ایسا اخلاص نہ ہو تو وہ عمل قبول نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ قیامت میں فرمائیں گے کہ جس نے جس کیلئے بھی عمل کیا ہو اس کا بدلہ اس سے لے لے میں شریکوں سے بے نیاز ہوں (مسند احمد) کسی عمل میں ریاکاری اور دکھاوے کا خیال آنے لگے تو نیت تازہ کر لے۔ ایسے ہی کسی عمل میں شرمساری سے بچنے کا خیال نہ لائے کہ اگر یہ نہ کروں گا تو خاندان والے کیا کہیں گے؟

دوسری چیز سنت کے مطابق ہونا اللہ تعالیٰ نے جس عمل کا بھی حکم فرمایا نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعہ اس کا نمونہ امت کو بتا اور دکھا دیا کہ نماز اس طرح پڑھو، حج یوں کرو اور کون سے کام نہ کرو۔ کوئی عمل بظاہر میں کتنا خوبصورت کیوں نہ ہو لیکن اگر سنت نبوی کے مطابق نہ ہو تو وہ نہ خوبصورت ہے نہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے یہی وجہ ہے کہ بدعات پر سخت وعیدیں احادیث میں آئی ہیں۔ تو ہر کام وعمل شروع کرنے سے پہلے معلوم کر لیں کہ اس کام کیلئے نبی کریم ﷺ کی سنت کیا ہے اور اس کے مطابق عمل کر لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اعمال کو خوبصورت بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مصائب کا علاج

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْ عَنْ کَثِیْرٍ ۝ (الشوریٰ۔۳۰)

یعنی ''اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کئے ہوئے کاموں کی وجہ سے پہنچتی ہے، اور بہت سے کاموں سے تو وہ درگذر ہی کرتا ہے۔''

اس آیت کے بیان میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: کسی بھی بندہ کو کوئی ذرا سی تکلیف یا بڑی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو وہ گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ جن گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے وہ ان گناہوں سے زیادہ ہوتے ہیں، جن پر مؤاخذہ ہوتا ہے۔ (ترمذی)

بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ مجرموں اور گناہگاروں کو امراض اور آفات پیش آتے ہیں۔ وہ سب گناہوں کے آثار ہوتے ہیں، جو لوگ گناہوں سے معصوم یا محفوظ ہیں، ان کے امراض و آفات ان کے صبر و استقلال کے امتحان اور جنت کے بلند درجات عطا کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔

ہم پر بیماری میں صرف ڈاکٹروں اور دواؤں کو اور مصائب میں صرف مادی سامانوں کو اپنا کارساز سمجھ کر اسی فکر میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ مالک کائنات کی طرف دھیان تک نہیں جاتا۔ حالانکہ قرآن کریم نے بار بار واضح الفاظ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ دنیا کے مصائب اور حوادث عموماً انسانوں کے اعمال بد کے نتائج اور آخرت کی سزا کا ہلکا سا نمونہ ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ مصائب مسلمانوں کیلئے ایک طرح کی رحمت ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے غافل انسان کو بیدار کیا جاتا ہے تاکہ وہ اب بھی اپنے اعمال بد کا جائزہ لے کر ان سے باز آنے کی فکر میں لگ جائیں۔ اور آخرت کی بڑی اور سخت سزا سے محفوظ رہیں۔ اسی مضمون کیلئے قرآن پاک کا ارشاد ہے: وَلَنُذِیْقَنَّھُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَکْبَرِ لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝ (السجدہ۔۲۱) یعنی ''اور اُس بڑے عذاب سے پہلے بھی ہم اُنہیں کم درجے کے عذاب کا مزہ بھی ضرور چکھائیں گے، شاید یہ باز آجائیں۔''

خلاصہ یہ ہے کہ عام انسان گناہوں سے خالی نہیں۔ ان کو بھی جو بیماریاں اور حوادث و مصائب یا تکلیف اور پریشانی پیش آتی ہے وہ سب گناہوں کے نتائج اور آثار ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تمام مصائب، پریشانیاں اور ہر قسم کے حوادث اور آفات کا اصل اور حقیقی علاج یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی طرف رجوع کیا جائے۔ پچھلے گناہوں سے معافی مانگی جائے اور آئندہ ان سے پرہیز کرنے کا پختہ ارادہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہی سے مصائب دور کرنے کی دعا کریں۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ مادی اسباب، دوا، علاج اور مصائب سے بچنے کی مادی تدبیریں بے کار ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل کارساز حق تعالیٰ جل شانہٗ کو سمجھیں اور مادی اسباب کو بھی اس کا انعام سمجھ کر استعمال کریں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہم سب کو گناہوں سے محفوظ فرمائیں۔ (آمین)

سب سے پہلے جنت میں جانے والے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّھَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ۝ (النسآء) ”وہ اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اِنعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں! ۔“

قیامت کے دن سب سے پہلے جنت میں جانے والے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام ہوں گے۔ کیونکہ ان کا مقام اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے ہاں سب سے بلند تر ہے، دوسرے درجے پر صدیقین۔ احادیث طیبہ میں انبیاء کے بعد ان کو سب سے پہلے جنت میں جانے والا فرمایا گیا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ ان لوگوں سے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ بہت ہی خوش ہوں گے۔ ان کے بعد اللہ تعالیٰ کے راستے میں اور اس کو راضی کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والے شہدا انبیائے کرام کے بعد سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ (شعب الایمان جلد۳ ص ۱۲۱)

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے گھروں اور مساجد میں پانچ وقت لوگوں کو نماز اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف بلانے والے مؤذنین بھی سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد جنت میں سب سے پہلے جانے والے شہداء پھر بیت اللہ، بیت المقدس اور مسجد نبوی کے مؤذنین پھر دوسرے مؤذنین اپنے اپنے اعمال کے مطابق داخل ہوں گے۔ (اس کے بعد) وہ لوگ جو خوشی و تکلیف ہر حالت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حمد کرنے والے ہوں۔ (طبرانی صغیر ج ۱، ص ۱۰۳) اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو اپنی حمد بہت پسندیدہ ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں: ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات ہوتے ہیں تو پھر انعام کے موقع پر زبان سے الحمدللہ کہیں اور ہو سکے تو دو رکعات نفل شکرانہ ادا کریں۔ اللہ کے ہر حکم پر عمل کی کوشش کریں۔ بلکہ کوئی تکلیف اور رنج کی بات پیش آئے تو اس پر بھی کہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ ۔ ”شکر ہے اللہ تعالیٰ کا ہر حال میں۔“ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ اَحْوَالِ اَھْلِ النَّارِ وَمِنَ النَّارِ بھی ساتھ ملا لیا کریں۔

(پھر وہ) غریب دیندار لوگ جو اہل وعیال والے ہیں اور دن رات ان کیلئے کماتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکموں کے پابند گناہوں سے پرہیز کرنے والے اور لوگوں سے کچھ نہ مانگنے والے۔ (ترمذی)

ایسے غریبوں سے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ وہ مالداروں سے 500 سال پہلے جنت میں جائیں گے۔ غریب اپنے فقر کو لوگوں کے آگے ظاہر نہ کرے بلکہ اللہ کے سامنے پیش کرے تو اللہ اس کیلئے رزق کے دروازے کھول دے گا اور جو لوگوں سے ظاہر کرے گا تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ فقر میں رکھیں گے۔ (لوگوں سے مانگے بغیر کچھ مل جائے تو رد نہ کرے لیکن نگاہ اللہ ہی پر ہو)

جو کسی کا غلام ہو یا ملازم ہو مگر ملازمت اس کو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے حق کی ادائیگی سے غافل نہ کرے بلکہ اپنے آقا کے حق کو بھی ادا کرنے والا ہو اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا حق بھی ادا کرے۔ (ترمذی۔ ج ۱ ص ۱۹۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ سب سے پہلے جنت میں وہ لوگ داخل ہوں گے جو دوسروں سے بھلائی کرنے والے ہوں اور ہر بھلائی صدقہ ہے۔ (کنز العمال حدیث 16438)

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہمیں ان اعمال کی توفیق نصیب فرما کر پہلے پہل جنت میں داخل ہونے والوں میں شامل فرمائیں۔ (آمین)

اصلاحِ معاشرہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الصف۔۲) ''تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ ''

قرآن حکیم کے ان دو جملوں میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اصلاح کرنے والا خود اس پر عمل نہ کرتا ہو۔ رسول اللہ! ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں آپ ﷺ نے دو بنیادی اصولوں پر عمل کیا۔ ایک تو یہ کہ آپ ﷺ نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس پر آپ ﷺ خود عمل نہ فرماتے ہوں، حضور ﷺ کے قول و فعل میں کبھی کوئی تضاد نہ تھا۔ جو فرماتے تھے خود اس پر عمل فرماتے تھے۔

اسلام کا کلمہ پڑھ لینے سے اور اپنا دین اسلام بنا لینے سے انسان کی زندگی چاہے مرد ہو یا عورت، غیر مسلموں سے بالکل الگ ہوجاتی ہے۔ ہر کام اور ہر حال میں مسلمان مرد و عورت کو حضرت رسول اکرم ﷺ کی پیروی کرنا لازم ہے۔

اسلامی تعلیم کا بنیادی مقصد انسانی معاشرے کی اصلاح کرنا ہے، اور اس طرح اصلاح کرنا ہے کہ دنیا میں تمام انسان امن و امان کی زندگی بسر کریں اور اس طرح زندہ رہیں کہ اخلاق کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اور آخرت کی لامتناہی زندگی کیلئے پورے اخلاق و تقویٰ کے ساتھ تیاری کریں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ان سے راضی ہو۔ اسلامی تعلیم کا یہ بنیادی مقصد صرف اس طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ خالقِ کائنات اور مالکِ کل اللہ رب العزت کے حکم کے مطابق ہم نورِ مجسم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے ہوئے یہ معلوم کریں کہ ختمی مرتبت ﷺ نے معاشرے کی اصلاح کس طرح کی تھی۔

ہمارے لئے اس دنیا کے کسی دوسرے مفکر اور مصلح اور کسی فلسفی اور رہبر کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں ہمارے سامنے ہر کام کی غایت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضا ہے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں واضح طور پر ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ اس کی رضا اور خوشنودی صرف رسول اللہ! ﷺ کی پیروی ہی سے حاصل ہوسکتی ہے، بلکہ اس نے ہم سے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ تم اللہ کے رسول کی پیروی کروگے تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ ذرا غور فرمایئے کسی انسان کیلئے اس سے زیادہ بڑا مرتبہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ خود اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس سے محبت کرنے لگے۔ مگر ہم نے اللہ اور رسول ﷺ اور قرآن و سنت سے صرفِ نظر کرکے خود کو اور پوری ملت اسلامیہ کو اس راہ پر ڈال دیا جو صرف ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ آج حال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر قسم کے رذائل سرایت کرچکے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عزت اور جان بھی اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں خطرے میں رہتی ہے۔ بالکل ایسا بھی نہیں ہے کہ اصلاح معاشرہ کی کوشش نہ ہورہی ہو، وعظ و تبلیغ کا ایک سلسلہ ہے جو قیام پاکستان کے بعد سے برابر جاری ہے۔ علمائے امت اور ائمہ مساجد ہر جمعہ لوگوں کو اچھا بننے کی تلقین بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن ان تمام کوششوں کا بظاہر کوئی مثبت نتیجہ نظر نہیں آتا۔ غالباً اس کی بہت بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم جو بات کہتے ہیں خود اس پر عمل نہیں کرتے، یہ طریقِ اصلاح سنت رسول ﷺ کے خلاف ہے، اس لئے کبھی برآور نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ہمیں اصلاحِ معاشرہ کیلئے رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنا ہوگا، آپ ﷺ کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا ہوگا۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے آخری رسول ﷺ کی پوری زندگی کا ریکارڈ ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے جمع کیا ہے، اس کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بلیغ ارشاد کے مطابق خود قرآن حکیم ہی آپ کی مبارک زندگی کا سب سے زیادہ قابل اعتماد وسیلہ موجود ہے۔

حقوق العباد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (الفجر۔۱۷تا۲۰) ”ہرگز ایسا نہیں چاہئے۔صرف یہی نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے، اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے، اور میراث کا مال سمیٹ سمیٹ کر کھا جاتے ہو، اور مال سے بے حد محبت کرتے ہو۔“

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے ان کو اس میں سے دیا جائے، اس لئے کہ یہ ان کا حق ہے اور اس کا شمار حقوق العباد میں ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنے کسی بھائی پر ظلم کر رکھا ہو کہ اس کی بے آبروئی کی ہو یا کوئی اور حق تلفی کی ہو تو آج ہی (اس دنیا میں اس کا حق ادا کر کے یا معافی مانگ کر) اس سے پہلے معاف کرا لے جہاں نہ دینار ہوگا نہ درہم، پھر فرمایا کہ اس کے کچھ عمل اچھے ہوں گے تو بقدر ظلم اس سے لئے جائیں گے (جو اصحاب حقوق کو دے دیئے جائیں گے) اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس ظالم کے سر ڈال دی جائیں گی۔ (بخاری شریف)

حقوق العباد کا معاملہ بہت اہم ہے، عام طور پر لوگوں کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی، دینداری بس نماز اور کرتہ داڑھی میں رہ گئی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی ستر (۷۰) نافرمانیاں لے کر قیامت کے میدان میں پہنچے تو یہ اس سے ہلکا جرم ہے کہ کسی بندے کا حق اپنے ذمہ لے کر میدانِ قیامت میں حاضر ہو۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بے نیاز ہے، اس سے معافی کی امید رکھی جائے لیکن بندے چونکہ محتاج ہیں، اس لئے ان کے حقوق کی ادائیگی کا دھیان رکھنا اور حقوق العباد سے پاک ہو کر جانا بہت زیادہ اہم اور نہایت ضروری ہے۔ بندوں سے وہاں معاف کرنے کی امید رکھنا بے وقوفی ہے۔ بندے وہاں محتاج ہوں گے، کسمپرسی کا عالم ہوگا، ذرا ذرا سا سہارا تلاش کرتے ہوں گے، اور ہر صاحب حق اپنا پورا پورا حق وصول کرنا چاہے گا۔ میراث کے بارے میں تو دینداری کے مدعی، پیر، فقیہ، عالم، جاہل عموماً مبتلائے مصیبت ہیں۔ مرنے والا مر جاتا ہے اور اس کا مال شرعی اصول کے مطابق ورثا میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ یتیموں، بیواؤں کے حصے دوسرے لوگ ہی کھا جاتے ہیں اور مرنے والوں کی بیویوں اور بیٹیوں کو میراث کے شرعی حصے نہیں دیئے جاتے۔ ہاں بدعت کے کاموں میں میراث کا مشترک مال سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ تیجے، چوتھے، جمعراتیں اور چالیسویں کے کھانے پک رہے ہیں، جو کام بدعت ہیں اور ان میں ریاکاری بھی مقصود ہوتی ہے۔ یتیموں، بیواؤں کا مال (جو انہیں میراث میں ملا ہے) بدعات اور خرافات میں خرچ کرتے چلے جاتے ہیں اور شریعت کے مطابق میراث تقسیم کرنے سے جان چراتے ہیں۔

قرآن حکیم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ یہ کائنات اور کائنات کی تمام چیزیں جو اردگرد موجود ہیں ان کی خدمت ومنفعت کیلئے پیدا کی گئی ہیں اور ان کا خالق اللہ ہے۔ ھوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا.

اس لئے تمام انسانوں پر کہ جو اس کرۂ ارض پر آباد ہیں، یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور دوسرے انسانوں کو فائدہ بھی پہنچائیں۔ دوسرے انسانوں کے مفاد کا، ان کے حصے کا، اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہی حقوق العباد کی ادائیگی ہے۔ اللہ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

فریضۂ جہاد اور ہم

اَعُوْذُ بِا للّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَمَاْوٰىہُ جَھَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝ (الانفال۔۱۵،۱۶)

"اے ایمان والو! جب کافروں سے تمہارا آمنا سامنا ہو جائے، جبکہ وہ چڑھائی کر کے آ رہے ہوں، تو اُن کو پیٹھ مت دکھاؤ، اور اگر کوئی شخص کسی جنگی چال کی وجہ سے ایسا کر رہا ہو، یا اپنی کسی جماعت سے جا ملنا چاہتا ہو، اُس کی بات تو اور ہے، مگر اُس کے سوا جو شخص ایسے دن اپنی پیٹھ پھیرے گا تو وہ اللہ کی طرف سے غضب لے کر لوٹے گا، اور اُس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔"

اس طرح کی بہت ساری آیات ہیں جن میں جہاد اور قتال کی تعلیم دی گئی ہے اور مجاہد کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ مجاہد کی فضیلت و عظمت کیلئے یہ بات کیا کم ہے کہ رب کریم نے مجاہدین کے گھوڑوں کی قسمیں کھائی ہیں۔

جہاد اسلام کا ایک اہم رکن ہے جس کی تاکید قرآن کریم میں بار بار کی گئی ہے۔ جہاد کے لغوی معنی ہیں "وہ جدوجہد اور کوشش و سعی کہ جو کسی ایسے مقصد کیلئے جو پہلے سے متعین ہو، تمام ممکنہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کی جائے۔" اور جہاد کے اصطلاحی معنی ہیں "غلبۂ اسلام اور اسلام اور ملت کی حفاظت کیلئے کی جانے والی ہر وہ کوشش جو خالصۃً اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کیلئے ہو۔" اعلائے کلمۃ اللہ کے حق میں ہر کوشش جہاد ہے، خواہ یہ کوشش قلم سے ہو، یا زبان سے، تحریر سے ہو یا تقریر سے، فکر سے ہو یا اسلحہ سے، جہاد اسلام کے اہم فرائض میں داخل ہے۔ اگر زمانہ امن نہ ہو یعنی اسلام اور ملت کے خلاف کوئی معرکہ درپیش ہو تو جہاد ایک ایسا فرض ہے کہ جس میں حصہ نہ لینا ایمان اور اسلام کے تقاضوں کے منافی ہے۔ یہاں تک جیسا کہ آیت مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ حصہ لینے کے بعد پیٹھ دکھانا ارتداد ہے۔ اور اسلام میں مجاہد کا جو مقام ہے، مجاہد کی جو شان ہے، مجاہد کا جو مرتبہ ہے وہ تو اپنی جگہ، رب تعالیٰ اپنی مقدس کتاب میں مجاہد کے گھوڑے کی قسمیں اٹھاتے ہیں اور حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن مجاہد کے اعمال نامہ میں اس کے گھوڑے کے بول و براز کا بھی وزن کیا جائے گا۔ ایسا کوئی عمل دکھایئے جس میں بول و براز کو تولا جاتا ہو۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی راہ میں لڑنے کیلئے مجاہدین کی صف میں ایک گھنٹہ ٹھہرنا ساٹھ سالہ عبادت سے افضل ہے۔"

حضور علیہ السلام نے فرمایا: "اللہ کی رضا کیلئے جہاد کا صرف ایک سفر پچاس حج کرنے سے افضل ہے۔" حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "اللہ کے راستے میں ایک ساعت کا قیام حجرِ اسود کے پاس شب قدر کی رات بھر کی عبادت سے افضل ہے۔"

حضور علیہ السلام نے فرمایا: "جہاد میں جن قدموں پر غبار پڑے گا، انہیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔"

مجاہد اگر زندہ واپس آ جائے تو غازی کہلاتا ہے اور قتل ہو جائے تو شہید کہلاتا ہے۔ شہید وہ عظیم انسان ہے جس کے بارے میں رب کریم فرماتے ہیں کہ اسے مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہے لیکن تم اس کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ (البقرۃ۔)

عالم اسلام اس وقت انتہائی صبر آزما حالات سے دوچار ہے۔ ایک طرف اس کا اپنا حال یہ ہے کہ اس نے انسانیت کے نام پر اللہ و رسول اور قرآن کے پیغام کو فراموش کر دیا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اسلام اور ملت دونوں دشمنوں کی یلغار کی زد میں ہیں، اب ہم مسلمانوں کا کام ہے کہ اس بات کی فکر کریں کہ اس یلغار کا جواب کس طرح دینا چاہیئے کہ دین و ملت کے مفادات محفوظ رہ سکیں۔

ایمان، قتال اور تبلیغ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (سورۃ العصر) ”زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے گھاٹے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں، اور نیک عمل کریں، اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کریں، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں۔“

تبلیغ کی اہمیت کتنی ہے اس بارہ میں اس ایک چھوٹی سی سورۃ العصر سے واضح ہوتا ہے کہ جس نے چار کام نہیں کئے وہ دنیا میں بھی خسارہ میں ہے اور آخرت میں بھی۔ کامیابی ایسے شخص کے قریب بھی نہیں آسکتی۔

اپنے زمانہ کے حالات تو ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے، کون لوگ سکون سے ہیں اور کون وہ ہیں جو دن رات پریشان ہیں، جن کو سکون نصیب نہیں۔ اپنے زمانہ کے حالات کے مشاہدہ اور گذشتہ زمانوں کے مفصل حالات قرآن پاک میں دیکھنے کے بعد یہ بات خوب محقق ہو جاتی ہے کہ جس شخص نے ان چار کاموں (جن کا سورۃ العصر میں ذکر ہے) میں سے کسی ایک کام کو بھی چھوڑ دیا وہی خسارہ میں رہا۔ اب مختصراً ان چاروں چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ ”زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے گھاٹے میں ہے۔“

غور کیجئے اللہ! اللہ ہو کر قسم اٹھا رہا ہے ”خسر“ میں تنوین تعظیم کیلئے ہے یعنی انسان بہت بڑے خسارہ میں ہے اگر ان میں سے ایک بھی چھوڑ دیا تو عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔

(۱) اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: یعنی اپنے عقائد درست کیجئے۔ عقائد درست نہ ہوں تو اعمال کا کوئی فائدہ نہیں۔ مشرکین مکہ بڑے بڑے نیک اعمال کرتے تھے، مگر عقائد شرکیہ تھے۔ جہنم کا ایندھن بنے۔ آج کل لوگ عقائد درست کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے، یہ بڑی غفلت اور دھوکہ ہے۔ یہ دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے کہ جنت کی امیدوں پر ساری عمر سجدے کر کر کے ماتھے پر محراب بن گیا مگر پھر بھی جہنم میں پھینکے گئے۔ (۲) وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اپنے اعمال درست کرو تمام امور میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی اطاعت کرو، خواہ کرنے کے ہوں یا چھوڑنے کے۔ کرنے کی چیزوں کو اوامر اور چھوڑنے کی چیزوں کو نواہی کہتے ہیں۔

(۳) وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ: آپس میں ایک دوسرے کو صحیح عقائد کی تبلیغ کرو۔ (۴) وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ: دین پر استقامت، منکرات کو چھوڑنا، اللہ کی نافرمانیوں سے بچنا یہ چیزیں بھی ایک دوسرے تک پہنچاؤ اور ان کی تبلیغ کرو۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے عقائد و اعمال کو تو درست کرے، مگر دوسرے کو عقائد و اعمال کی تبلیغ نہ کرے تو اپنے خیال میں کتنا ہی بڑا عابد و زاہد ہو، رات دن ذکر اللہ میں لگا رہتا ہو ہر وقت نوافل اور بڑی بڑی عبادات کرتا رہتا ہو، مگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچ سکے گا۔

اگر کفار کی طاقت زور پکڑ جائے یعنی جب کفر اسلام کو دبانا چاہے تو تبلیغ کی ایک اور قسم بھی اختیار کرنا پڑے گی یعنی تلوار سے تبلیغ۔ جس کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ اتنا قتال کریں اتنا جہاد کریں اور اس قدر تلوار کا اسلحہ استعمال کریں کہ کفر کی کمر ٹوٹ جائے۔ قتال اسی امت میں نہیں سابقہ امتوں میں قتال و جہاد بالسیف تھا۔ مگر یہ سب اس صورت میں ہے کہ جب زبانی تبلیغ کافی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مسلمان کا لباس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیْرٌ ؕ

"اے آدم کے بیٹو اور بیٹیو! ہم نے تمہارے لئے لباس نازل کیا ہے جو تمہارے جسم کے اُن حصوں کو چھپا سکے جن کا کھولنا بُرا ہے، اور جو خوشنمائی کا ذریعہ بھی ہے۔ اور تقویٰ کا جو لباس ہے، وہ سب سے بہتر ہے۔" (سورہ اعراف۔۲۶)

اس آیت مبارکہ میں دو مقاصد بیان کئے گئے ہیں کہ لباس سے انسان موسمی اثرات سے محفوظ رہتا ہے اور اس سے شرم وحیا کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ گویا جس لباس سے یہ مقاصد پورے نہ ہوں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے لباس نہیں کہا جا سکتا۔

لباس تن ڈھانکنے کی چیز ہے اور اس فائدہ کے علاوہ سردی وگرمی کا بچاؤ بھی لباس سے ہوتا ہے۔ دین اسلام نے خوبصورت لباس پہننے کی اجازت دی ہے مگر اس حد تک اجازت دی ہے کہ فضول خرچی نہ ہو، اور اترانا، اور دکھاوا مقصود نہ ہو اور غیر قوموں کا لباس نہ ہو اور بے شرمی اور بے حیائی کا لباس نہ ہو۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول مقبول ﷺ نے فرمایا کہ کھاؤ پیو اور صدقہ کرو اور پہنو جب تک کہ فضول خرچی اور خود پسندی (یعنی مزاج میں بڑائی) نہ آئے۔ (رواہ احمد، نسائی، ابن ماجہ)

لباس پہننے میں فضول خرچی نہ ہو، خود پسندی نہ ہو، دکھاوا اور غیر قوموں کی مشابہت نہ ہو اور بے شرمی اور بے حیائی کا لباس نہ ہو۔ یہ احکام مردوں اور عورتوں کے لباس میں مشترک ہیں۔ البتہ مردوں کیلئے دو چیزیں اور زائد ہیں اول یہ کہ ریشم کا کپڑا نہ ہو، دوسرا ٹخنوں سے نیچا نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ازار (تہبند) لنگی کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ دوزخ میں (لے جانے والا) ہے۔ (رواہ البخاری)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کی لنگی آدھی پنڈلیوں تک ہو، آدھی پنڈلیوں اور ٹخنوں کے درمیان ہو تو اس میں (بھی) گناہ نہیں اور جو اس سے ٹخنوں سے نیچے ہو وہ دوزخ میں (لے جانے والا) ہے۔ یہ بات تین بار فرمائی اور فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو (نظرِ رحمت سے) نہیں دیکھے گا جس نے اپنی لنگی کو اتراتے ہوئے گھسیٹا۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

ان دونوں حدیثوں میں ٹخنے سے نیچے لنگی پہننے والے کیلئے سخت وعید ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اسبال یعنی خلاف شرع کپڑے کا لٹکانا لنگی، کرتہ، پگڑی میں ہے۔" (ابوداؤد، نسائی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ٹخنے سے نیچے پہننے کی وعید صرف لنگی ہی کے بارے میں نہیں ہے۔ اگر کسی نے کرتہ اتنا نیچا پہنا، پگڑی کا شملہ اتنا نیچا رکھا جس سے ٹخنے ڈھک جائیں تو یہ بھی نیچا پہننے کی وعید میں شامل ہے۔ جب پگڑی اور کرتہ میں یہ بات ہے تو شلوار یا پتلون ٹخنے سے نیچے پہننا کیسے حلال ہوگا۔ لنگی یا پائجامہ، شلوار، پتلون کوئی بھی چیز ٹخنے سے نیچے پہنی جائے وعید ان سب کو شامل ہے۔ پتلون میں ٹخنوں سے نیچا ہونے کے علاوہ دوسری وجہ ممانعت فساق اور کفار کی مشابہت بھی ہے۔ کیونکہ جو دنیا میں اس کو پہنے گا وہ آخرت میں اس کو نہیں پہن سکے گا۔ ابوداؤد کی حدیث ہے کہ جس شخص نے وسعت اور قدرت کے باوجود لباس میں سادگی اختیار کی خداوند تعالیٰ اس کو قیامت میں بہترین لباس سے آراستہ کرے گا۔

اسلام زندگی کے ہر شعبے میں توازن قائم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ چیز ناپسندیدہ ہے جس سے غرور، نخوت، اور ریاء کی بو آتی ہے۔ اسے سادگی اور میانہ روی پسند ہے۔

حلال چیزیں کھاؤ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ ۝ (البقرہ)

''اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں رزق کے طور پر عطا کی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ، اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر واقعی تم صرف اسی کی بندگی کرتے ہو۔''

اس آیت شریف میں پاکیزہ چیزوں کے کھانے کا حکم فرمایا اور اللہ پاک نے جو نعمتیں دی ہیں ان کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اگر تم اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر کرو۔ کیونکہ جو عبادت اس کی عظمت و کبریائی کے شایانِ شان ہے وہ شکر کے بغیر کامل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے جو رزق عطا فرمایا ہے اسے کھاؤ پیو اور شکر کرو۔

سورۃ سبا میں فرمایا: ''کُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّکُمْ وَاشْکُرُوْا لَہٗ ط''۔ (سبا۔۱۵) ''اپنے پروردگار کا دیا ہوا رزق کھاؤ، اور اُس کا شکر بجالاؤ۔'' نعمتوں کے شکر کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی اطاعت وعبادت میں مشغول ہوں اور اس کی نعمتوں کو گناہوں میں خرچ نہ کریں۔ ''مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ'' میں یہ بھی نکتہ ہے کہ دوسروں کا مال چھین کر یا چرا کر یا خیانت کر کے استعمال نہ کیا جائے کہ اللہ نے جو مال جس کسی کو دیا ہے وہ اگرچہ فی نفسہٖ اصولِ شریعت کے مطابق حلال اور طیب ہے۔ لیکن دوسروں کیلئے اسی وقت حلال اور طیب ہوگا جبکہ حلال طریقہ سے صاحب مال سے حاصل کیا ہو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میرے دونوں کان بہرے ہو جائیں اگر میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہو کہ جس نے دس درہم کا کپڑا خریدا اور ان میں ایک درہم حرام کا تھا تو جب تک وہ کپڑا اس کے بدن پر رہے گا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس کی نماز قبول نہ فرمائے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح۔ ص ۲۴۳)

جب کپڑے میں دسواں حصہ حرام کا ہونے سے نماز قبول نہیں ہوتی تو جس کے سارے کپڑے اور کھانا، پینا حرام کا ہو اس کی نماز کیسے قبول ہوگی؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں فرماتے جس کے پیٹ میں حرام جاتا ہو۔ (احیاء العلوم)

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ بغیر پاک ہوئے کوئی نماز قبول نہیں ہوتی اور حرام مال سے کوئی صدقہ قبول نہیں ہوتا۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حرام آمدنی سے صدقہ کر دیا جائے تو باقی سب مال حلال ہو جاتا ہے۔ حرام سے صدقہ کرنا تو اور گناہ ہے، وہ مقبول نہیں ہوتا۔ جو صدقہ خود قبول نہیں ہوتا اس کے ذریعہ سے باقی مال کیسے حلال ہو جائے گا؟ جو صدقہ دیا وہ بھی وبال ہے اور جو باقی مال ہے وہ بھی وبال ہے اور آخرت کے عذاب کا ذریعہ ہے۔

مقبول عبادت نہیں بے اکلِ حلال ہے حکم خدا کہ کھاؤ تم طیب مال

حلال کمانا فرض ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ۝ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا ؕ

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، اِلا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو (تو وہ جائز ہے)، اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین جانو اللہ تم پر بہت مہربان ہے (۲۹) اور جو شخص زیادتی اور ظلم کے طور پر ایسا کرے گا، تو ہم اس کو آگ میں داخل کریں گے۔'' (النساء ۲۹، ۳۰)

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اکتسابِ مال کی جن صورتوں کو حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں: ☆ رشوت ☆ غصب خیانت ☆ چوری ☆ یتیم کے مال میں بے جا تصرف ☆ ناپ تول میں کمی ☆ فحاشی پھیلانے والے ذرائع کا کاروبار ☆ قحبہ گری اور بدکاری کی آمدنی ☆ شراب کی صنعت ☆ جوا ☆ بت گری ☆ بت فروشی ☆ بت خانوں کی خدمت ☆ قسمت بتانے والے اور فال گیری کا کاروبار اور سود خوری وغیرہ۔ ان تمام ذرائع سے جو روزی حاصل ہو اسلام ان سب کو حرام قرار دیتا ہے۔ حلال روزی صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان محنت کرے، دیانت و امانت کو پیشِ نظر رکھے، کسی کا حق نہ مارے، کسی کو تکلیف نہ دے، فرائض اور حقوق کا خیال رکھے اور یہ سمجھ لے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی رازق ہے اور وہی اکلِ حلال کا سامان کرتا ہے۔ پس اللہ ہی سے صراطِ مستقیم کی استدعا کرے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ! ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حلال کا طلب کرنا (نماز، روزہ وغیرہ کے بعد) فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز فرض ہوگی اس میں ثواب بھی ہوگا۔ شریعتِ اسلامیہ میں حرام مال کمانے کی ممانعت ہے اور حلال کمانے کی ترغیب ہے اور حرام طریقوں کی نشاندہی کر دی ہے کہ ان کے ذریعے مال نہ کمائیں۔ پھر جو مال کمایا جائے اسے گناہوں میں نہ لگائیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت کریں۔ اگر حلال مال کیلئے کوشش کی جائے تو ضرور ملتا ہے۔ واجبی ضرورت کیلئے حلال ملازمت، چھوٹا موٹا کاروبار تقریباً ہر جگہ میسر ہوتا ہے۔ زیادہ مال کی طلب میں سیٹھ بننے اور بینک بیلنس زیادہ کرنے کیلئے حرام طریقوں سے کمانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور زیادہ مال کا طالب ہی عموماً گناہوں کے ذریعے مال کماتا ہے اور اس کیلئے اپنے خیال میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اور یہ اپنی خود ساختہ مجبوری ہوتی ہے۔ اصولی طور پر کسبِ مال کیلئے دنیا میں چار طریقے ہیں۔ تجارت، زراعت (جس میں شجرکاری بھی داخل ہے) ملازمت، صنعت۔ ان میں تجارت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ تھوڑا سا مال لے کر بیٹھو تو شدہ شدہ بڑی تجارت ہو جاتی ہے اور اپنے ہاتھ کی دستکاری سے جو حاصل کیا جائے وہ بھی بہت مبارک ہے۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ! ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون سا کسب افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: انسان کا اپنے ہاتھ سے عمل کرنا (یعنی ضرورت کی چیزیں بنانا) اور ہر وہ بیع جو مبرور ہو۔ (جس میں حرام طریقوں سے پرہیز کیا گیا ہو اور حلال طریقوں کو اختیار کیا گیا ہو)۔ (طبرانی) نیز حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ: ''کسی شخص نے اس کھانے سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا جو اس کے اپنے ہاتھ کے عمل سے ہو اور بلاشبہ اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کے عمل سے حاصل کیا ہوا رزق کھاتے تھے۔'' (بخاری) حضرت داؤد علیہ السلام لوہے کی زرہیں بنایا کرتے تھے اور انہیں فروخت فرماتے تھے۔ حلال روزی اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل ہے، یہ اللہ کا انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانانِ عالم کو اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرمائیں اور حلال روزی کے ذریعہ سے ہم پر اپنا فضل و رحم فرمائیں۔ (آمین)

سفر کے آداب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ (سورۃ الزخرف۔۱۳)

"پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے بس میں دے دیا، ورنہ ہم میں یہ طاقت نہیں تھی کہ اس کو قابو میں لا سکتے۔"

یعنی چوپایوں یا کشتی پر یا کسی اور سواری پر سوار ہوتے وقت اللہ کا احسان دل سے یاد کرو کہ ہم کو اس نے اس قدر قوی اور ہنر مند بنا دیا کہ اپنی عقل و تدبیر وغیرہ سے ان چیزوں کو قابو میں لے آئے۔ یہ محض خدا کا فضل ہے ورنہ ہم میں اتنی طاقت اور قدرت کہاں تھی کہ ایسی ایسی چیزوں کو مسخر کر لیتے۔ نیز دلی یاد کے ساتھ زبان سے سواری کے وقت یہ الفاظ کہنے چاہئیں۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ اور بھی اذکار و ادعیہ احادیث میں آئی ہیں جو کتب حدیث و تفسیر میں مذکور ہیں۔

سفر کے چند آداب مندرجہ ذیل ہیں:

☆ سفر کو روانہ ہوتے وقت چار رکعت نفل نماز پڑھ لینا چاہیئے۔ (مجمع الزوائد)

☆ ہمارے پیارے رسول سرورِ عالم ﷺ جمعرات کے دن سفر میں جانے کو پسند فرماتے۔ (بخاری)

☆ اور تنہا سفر کرنے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ ☆ بلکہ اگر دو آدمی ساتھ ہوں تب بھی سفر کرنے سے منع فرمایا۔

☆ اور اس کی ترغیب دی کہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہوں۔ اور چار ساتھی ہوں تو بہت ہی اچھا ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

☆ اور فرمایا کہ جب سفر میں تین آدمی ساتھ ہوں تو ایک کو امیر بنا لیں۔ (ابوداؤد)

☆ آپ ﷺ نے فرمایا سفر میں جس کے پاس اپنی ضرورت سے فاضل کھانے پینے کی چیزیں ہوں تو ان لوگوں کا خیال کرے جن کے پاس اپنا توشہ نہ ہو۔ (مسلم)

☆ آپ ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو چاشت کے وقت مدینہ میں داخل ہوتے اور پہلے مسجد میں جا کر دو رکعتیں پڑھتے، پھر کچھ دیر لوگوں کی ملاقات کیلئے وہیں تشریف فرما رہتے۔ (بخاری)

☆ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے ساتھیوں کا سردار وہ ہے جو ان کا خدمت گذار ہو۔ جو شخص خدمت میں آگے بڑھ گیا کسی عمل کے ذریعہ اس کے ساتھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے، ہاں اگر کوئی شہید ہو جائے تو وہ آگے بڑھ جائے گا۔ (بیہقی)

☆ سفر میں جن لوگوں کے پاس کتا یا گھنٹی ہو ان کے ساتھ رحمت کے فرشتے نہیں ہوتے۔ (مسلم)

☆ جب کسی منزل پر اترو تو سب اکٹھے قیام کیا کرو اور ایک ہی جگہ رہو اور دور دور قیام نہ کرو۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے، تمہیں نیند سے اور کھانے پینے سے روکتا ہے لہٰذا جب وہ کام پورا ہو جائے جس کیلئے گئے تھے تو جلد واپس آ جاؤ۔" (بخاری و مسلم)

خوش کلامی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط (اسراء۔۵۳)

"میرے (مومن) بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہا کریں جو بہترین ہو۔"

اس آیت مبارکہ میں انسان کے شرف وعزت پر انسان کو متوجہ کیا اور انسانوں میں محبت باہمی کو بلند تر درجہ دیا اور حسنِ کلامی کے ساتھ درسِ خوش کلامی دیا۔ مسند ابن حنبل میں مروی ہے ایک بار ایک صحابی نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ ڈر کس بات کا ہونا چاہیئے؟ حضور اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "اس کا" اور پھر ارشاد فرمایا: "خوش کلامی جنت کی اور بدکلامی دوزخ کی نشان دہی کرتی ہے۔

خوش کلامی درحقیقت خوش اخلاقی ہے اور خوش اخلاقی قطعی طور پر ایمان ہے۔ اگر انسان کے اخلاق بلند ہیں تو لازماً وہ خوش کلام بھی ہوگا۔ دراصل خوش کلامی اور خوش گفتاری یعنی آپس میں احترام واکرام اور اخلاق سے بات کرنا اخلاق کی بلندی کا مظہر ہے۔

تاریخ اقوام، ملل اس کی شاہد ہے کہ کبھی اور کسی بھی دور میں بدکلامی نے کسی انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اور خوش کلامی نے ہمیشہ فتح پائی ہے اور دلوں کو مسخر کرلیا ہے۔ درحقیقت انسان فطرت سے جنگ نہیں کرسکتا، بدکلامی قطعی طور پر ایک غیر فطری عمل ہے اور خوش کلامی انسان کی فطری طینت اور خصلت ہے اور اس کی جبلت ہے۔

☆ خوش کلامی زبان کا صدقہ ہے ☆ خوش کلامی علم کی اولاد معنوی ہے ☆ خوش کلامی صراطِ مستقیم کی طرف لے جاتی ہے ☆ خوش کلامی ایسی طاقت ہے کہ جو صداقت کو الفاظ کا جامہ پہناتی ہے ☆ خوش کلامی سے ہزاروں بار قیام امن کا پلہ جھک گیا ہے ☆ خوش کلامی اور صداقت انسان کو بے خوف بنادیتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں ہمارے رسول سرورِ کائنات، فخرِ موجودات ﷺ نے ہمیشہ خوش کلامی سے کام لیا ہے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ نرم گفتگو فرمائی ہے، آپ ﷺ نے ہمیشہ محبت کی بات کی ہے۔ ذرا غور فرمایئے حیاتِ رسول ﷺ کا ایک ایک لمحہ مہمات سے عبارت ہے، آپ ﷺ ایک ایسے انقلاب عظیم کے بانی ہیں کہ جو اس عالم ارض کیلئے وجہ رحمت بنا۔ اسلام کو کامیاب بنانے میں اور ایک انقلاب عظیم برپا کرنے میں آنحضرت ﷺ کا ہر لمحہ مسائل سے دوچار رہا اور آپ ﷺ نے ہر مسئلے کو خوش اسلوبی اور خوش کلامی سے حل کرلیا اور پھر اسلام کی روشنی نے بالآخر سارے عالم کو روشن کردیا۔ ہم رسول پاک ﷺ کے امتی ہیں، امتِ محمدی میں ہمارا شمار ہونا ہمارے لئے باعثِ فخر اور سبب انبساط ہے اور موجب نجات ہے۔ یہ فخر اس وقت صحیح اور اس وقت بجا ہوسکتا ہے جب ہم رسول پاک ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اپنالیں، ان کی بتائی ہوئی راہوں پر چلیں اور ان کے اصولِ زندگی کو اختیار کریں۔

آیئے بسم اللہ کریں اور عہد کریں اور آج یہ فیصلہ کریں کہ اب ہم ہمیشہ خوش کلامی کو اختیار کریں گے۔ یقین کیجئے کہ یہ فیصلہ اگر ہر فردِ ملت کرلے تو ملتِ اسلامیہ کی قسمت بدل سکتی ہے۔ ایمان، اخلاق اور خوش کلامی معاشرے کی ہر خرابی کو دور کرسکتی ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں فہم وفراست کی نعمتوں سے مالا مال فرمائیں۔ اور حسنِ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

مآخذ

☆۱.....نورستان.....حکیم محمد سعید صاحب

☆۲.....معارف مفتی اعظمؒ.....مفتی محمد شفیع صاحبؒ

☆۳.....تفسیر عثمانی.....شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

☆۴.....گلدستہ تفاسیر.....الحاج عبدالقیوم مہاجر مدنی

☆۵.....گلدستہ احادیث.....الحاج عبدالقیوم مہاجر مدنی

☆۶.....پچاس تقریریں جلد اول.....مولانا اسلم شیخوپوری صاحب

☆۷.....ماہانہ علم وعمل لاہور.....شوال، جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ

☆۸.....ماہنامہ علم وعمل لاہور.....صفر المظفر ۱۴۳۱ھ

☆۹.....فضائل صدقات.....شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ

☆۱۰.....اپنی اصلاح کا مکمل نصاب جلد سوم.....قطب الدین ملا

☆۱۱.....تنبیہ الغافلین.....فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ

☆۱۲.....محاسن اسلام ملتان.....ربیع الاول، ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ، ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ

☆۱۳.....ندائے شاہی مارچ 1988ء.....انڈیا

☆۱۴.....احیاء العلوم.....امام غزالیؒ

☆۱۵.....تفسیر ابنِ کثیرؒ.....حافظ عماد الدین ابوالفدا اسمٰعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی رحمۃ اللہ علیہ

☆۱۶.....وعظ حقوق البیت.....مولانا اشرف علی تھانویؒ

☆۱۷.....آپ کے مسائل اور ان کا حل جلد نمبر ۷.....مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

☆۱۸.....تحفۃ المسلمین جلد دوم.....مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی بلند شہری رحمہ اللہ

☆۱۹.....محاسنِ اسلام.....محرم، صفر ۱۴۳۲ھ ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ ملتان

☆۲۰.....انوار الرشید.....مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ

☆۲۱.....روزنامہ اسلام ۲۴ محرم ۱۴۳۲ھ.....کراچی

☆۲۲.....نظامِ خلافتِ راشدہؓ.....خیر پور (سندھ)

☆۲۳.....علم وعمل.....ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

☆۲۴.....ماہنامہ تذکرہ دار العلوم کبیر والہ ضلع خانیوال.....ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

☆۲۵.....تفسیر عثمانی.....مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ

☆۲۶.....تحفۃ الائمہ.....مولانا محمد حنیف عبدالمجید صاحب

UMAR SHAHEED LIBRARY Mohra Kot Chashma (Chakwal) Pakistan
عمر شہید لائبریری موہڑہ کوٹ چشم (چکوال) پاکستان

مؤلف کی دیگر تالیفات

خود پڑھیے اور دوسروں کو ہدیہ کیجیے

برائے رابطہ
0333-5902896
0312-5912896
0333-5788212
0334-8758034